www.urducouncil.nic.in

نومبر 2022 ، قیمت :- 10₹

ماہنامہ

بچوں کی دنیا

نئی دہلی

Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

بچوں کے قلمکاروں کے لیے سوالنامہ

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' میں بچوں کے قلمکاروں سے انٹرویوز کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے تاکہ بچوں کو قلمکاروں اور کتابوں کے بارے میں معلومات کے ساتھ ساتھ اپنا مستقبل اور کریئر بہتر بنانے کے لیے نئی روشنی اور نئی راہ بھی مل سکے۔
یہ ادارے کی طرف سے تیار کردہ سوالات ہیں، ان کے جوابات ادب اطفال سے جڑا ہوا کوئی بھی قلمکار دے سکتا ہے۔

1 بچپن کی کون سی باتیں/شوخیاں/شرارتیں اب بھی آپ کو بہت یاد آتی ہیں؟
2 بچپن میں آپ کے پسندیدہ مصنّفین کون تھے اور اب کون ہیں؟
3 بچپن میں کس کتاب نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا؟
4 بچپن میں بچوں کے کون سے رسائل آپ پڑھتے تھے؟
5 بچوں کے ذہنی اور فکری ارتقا کے لیے کون سی کتابیں زیادہ مفید ہیں؟
6 زبان و بیان کو بہتر بنانے کے لیے کن مصنّفین کی کتابیں بچوں کے لیے رہنما ثابت ہوسکتی ہیں؟
7 مستقبل اور اپنے کریئر کو سنوارنے کے لیے بچوں کو کن موضوعات اور کتابوں کا مطالعہ کرنا فائدہ مند ثابت ہوگا؟

---

8 اپنے سوانحی اور تعلیمی کوائف کے بارے میں کچھ بتائیں؟
9 آپ کو بچوں کے لیے لکھنے کا خیال کب اور کیسے آیا؟
10 آپ کی پہلی تخلیق، کب اور کس رسالے میں شائع ہوئی؟
11 آپ کے مرکزی موضوعات کیا ہیں؟
12 کتاب لکھنے سے پہلے آپ بچوں کی نفسیات اور ذہنی مطالبات پر ریسرچ کرتے ہیں یا نہیں؟
13 بچوں کے لیے لکھتے ہوئے آپ کو کس طرح کی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟
14 ادیب اطفال کی حیثیت سے ادبی اور علمی حلقے میں آپ کی قدر ہوتی ہے یا نہیں؟
15 کیا آپ اب بھی بچوں کے لیے لکھی گئی کتابیں پڑھتے ہیں؟
16 انگریزی اور دیگر زبانوں میں شائع ہونے والے کون سے رسالے بچوں کے لیے مفید ثابت ہوسکتے ہیں؟
17 کیا اردو میں بچوں کے لیے انگریزی، تیلگو اور دیگر زبانوں جیسا شائع ہونے والا کوئی مکمل رسالہ موجود ہے؟
18 بچوں کے ادب پر جو رسائل شائع ہو رہے ہیں، ان کے مواد اور زبان و بیان سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟
19 معاصر ادب اطفال سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟
20 بچوں کے لیے لکھتے ہوئے آج کے دور میں کن موضوعات پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے؟
21 بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے کچھ مفید تجاویز اور مشورے!
22 ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' میں آپ کس نوع کی تبدیلی چاہتے ہیں؟
23 بچوں کے لیے آپ کا کوئی پیغام!

* جوابات کے ساتھ پاسپورٹ سائز تصویر اپنی کتابوں کا عکس ضرور ارسال کریں۔

اس شمارے میں

اداریہ	مدیر	04
ڈاک خانہ	قارئین	05
	مضامین	
ڈاکٹر سالم علی	انس مسرور انصاری	06
نیل گائے	اکبر خان اشک جالوری	10
عظیم مجاہد آزادی رانی لکشمی بائی	حبیب سیفی	12
	انٹرویو	
تعلیم کے ساتھ تربیت پر بھی توجہ ضروری	رفیق گلاب	15
	نظمیں	
کوئی بھی کام سرسری نہ کرو	رؤف خیر	20
ایک نظم، گیارہ ملک	انصار احمد معروفی	21
اچھی بات بھلی لگتی ہے	التفات امجدی	22
گڑبڑ جھالا	فہیم احمد	23
بیٹھ کے چڑیا پالکی	وسیم احمد نگرامی	24
جگنو	شمیم اختر	25
پیار کا گلشن	بشریٰ یاسمین	26
	کہانیاں	
ایک بے سر پیر کی کہانی	ذکیہ مشہدی	27
ٹماٹر کہاں سے لاؤں	محمد قمر سلیم	30
کانجی ہاؤس	بابو آر کے	32
پودوں کی فریاد	سلیم خان	35
امداد باہمی	سلطان آزاد	38
گیان کا پٹارا	محمد عادل	40
اسکول بس	محمد گلزار عالم	45
	ڈراما	
زندگی کے اتار چڑھاؤ	شیخ فرحان رؤف	49
	بچوں کا کتب خانہ	
ہوا محل/ منظور وقار	محمد اکرام	52
	سائنس نامہ	
اسٹار فش	محمد شمس الحق	54
	صحت اطفال	
سیتا پھل اور ہزار فائدے	رونق جمالی	56
	زبان شناسی	
آنکھ، مفاہیم اور متعلقات	خاں صاحب مولوی سید احمد دہلوی	58
	کہکشاں	
چمن چمن کے پھول		60
	ننھے فنکار	
پینٹنگ		61

بچوں کی دنیا

جلد: 10 شمارہ: 11 نومبر 2022

مدیر: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم: ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

معاون مدیر: ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت تعلیم۔ محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون:49539000

شعبہ ادارت: 49539009-11

ای میل
bachonkiduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: /10 روپے، سالانہ/100 روپے

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبہ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت
ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم
نئی دہلی-110066
فون:26109746

ای میل:sales@ncpul.in

علاقائی مرکز: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002
فون:040-24415194

پیارے بچو! یہ اکیسویں صدی ہے، جسے الیکٹرانک اور ٹکنالوجی کا سنہرا دور بھی کہا جاتا ہے، بہت سے نئے نئے آلات ایجاد ہوئے اور ہو رہے ہیں، جس سے ہر کوئی مستفید ہو رہا ہے۔ انہی آلات میں ایک اہم موبائل فون بھی ہے۔ امریکہ کے ایک انجینئر مارٹن کوپر نے 1973 میں وائرلیس فون بنایا۔ آج ہمارے اور آپ کے ہاتھوں میں جو اسمارٹ فون ہے، یہ اسی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ اس کی مدد سے ہم دور دراز کے رشتے داروں، دوستوں اور دیگر لوگوں سے بات کر سکتے ہیں ساتھ ہی کوئی پیغام اور ویڈیوز بھی بھیج سکتے ہیں۔ اب تو یہ اتنا ترقی کر گیا ہے کہ اس کے ذریعے ملک اور بیرون ملک ویڈیو کال کے ذریعے ایک دوسرے کو دیکھ اور سن سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ای میل، واٹس ایپ، فیس بک، ٹوئٹر، ویڈیو گیمز، نیوز چینلس کے ذریعے خبروں سے آگاہی اور تصاویر اور ویڈیو بھی بنا سکتے ہیں۔ موبائل اور انٹرنیٹ ہمارے لیے کسی نعمت سے کم نہیں۔ آج انٹرنیٹ کے بغیر ہر چیز ادھوری ہے۔ بلاشبہ موبائل فون حالات سے باخبر رہنے اور رکھنے کا ایک بہترین آلہ ہے۔

موبائل فون کی وجہ سے تعلیمی دنیا میں ایک نیا انقلاب آگیا ہے۔ خاص طور پر کورونا وبا کی وجہ سے تو اس کی اہمیت وافادیت میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ وبا کے زمانے میں آن لائن کلاس موبائل کی وجہ سے ہی ممکن ہو سکی۔ پیارے بچو! گوگل معلومات کا ذخیرہ ہے۔ اس کے ذریعے آپ کی رسائی کسی بھی کتاب تک ممکن ہے۔ ہر طرح کی کتابیں گوگل پر دستیاب ہیں۔ اسی طرح اگر کسی لفظ کا معنی دیکھنا چاہیں تو کئی ڈکشنریاں یہاں پر مل جائیں گی۔ ہر سبجیکٹ کی کلاسز کی ویڈیوز اور دیگر مواد بھی یوٹیوب کے ذریعے دیکھ سکتے ہیں اور اپنے علم اور صلاحیت میں خاطر خواہ اضافہ کر سکتے ہیں۔ ہر مضمون سے متعلق لیکچرس اور سوالات وجوابات بھی وافر مقدار میں یہاں موجود ہیں۔ اس لیے آپ لوگ اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔ آن لائن کتابیں پڑھیں، موٹیویشنل تقاریر سنیں، اپنے بڑے اور اساتذہ کے مشورے سے اچھی اچھی کہانی کی کتابیں پڑھیں۔ یہاں ہر زبان کی کتابیں بس چند سیکنڈوں میں آپ کے سامنے ہوں گی۔ موبائل فون کے بہت سے فائدے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ وقت کا صحیح استعمال کرتے ہوئے ہم اس سے خوب فائدہ اٹھائیں تا کہ ہم کسی سے تعلیمی اور دیگر میدان میں پیچھے نہ رہ جائیں۔

پیارے بچو! موبائل فون کے کئی نقصانات بھی ہیں۔ اسے زیادہ دیکھنے سے آنکھوں کی بینائی پر اثر پڑتا ہے۔ سوشل میڈیا اور آن لائن گیمز وغیرہ کی عادت آپ کو مقصد اور منزل سے ہٹا سکتی ہے، نیز چڑچڑاپن، تناؤ اور بے چینی کی کیفیت سے آپ ہمیشہ دوچار رہیں گے۔ اس کے مسلسل استعمال سے یقیناً آپ کی صحت بھی متاثر ہوگی۔ اس کی عادت آپ کو بے راہ روی کی طرف بھی لے جا سکتی ہے۔ اس لیے انٹرنیٹ اور موبائل کا استعمال مطالعہ اور ضروری کاموں کے لیے ہی کریں۔ تفریحی گیمز اور چیٹنگ وغیرہ سے حتی الامکان اجتناب کریں اور غیر ضروری چیزوں میں اپنا قیمتی وقت برباد نہ کریں۔

آپ کا

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاک خانہ

اکتوبر کا شمارہ بروقت ملا۔ گاندھی جی کی تصویر سرورق پر بہت خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔ میرے گھر میں بچے اور بڑے پابندی سے اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ہمیشہ کی طرح رسالے کی چمک دمک برقرار ہے۔اس کا فائدہ یہ ہے کہ گھر کے بچے سرورق کو دیکھ کر فوراً رسالے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اس رسالے کو ترتیب دینے میں آپ لوگ واقعی بہت محنت کرتے ہیں اور فہرست مرتب کرنے میں بچوں کی نفسیات پر خاص توجہ ہوتی ہے۔ یہی اس رسالے کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ مدیر نے اداریے میں گاندھی جی کا مختصر مگر جامع تعارف کرایا ہے، جس سے کہ ان کی شخصیت، کوشش، جدو جہد سب پر روشنی پڑتی ہے۔ایک عظیم ہستی کے تحت گاندھی جی کی زندگی ،ان کے اخلاق، کردار، بچوں سے ان کا پیار اور ان کے تعلق سے فکرمندی یہ سب اس کے تحت آگئے ہیں، اس کے مطالعے سے واقعی بچوں کے ذہن پر مثبت اثر پڑے گا۔ گاندھی جی پر راز دان شاہد کا مضمون بھی اچھا ہے۔ مختلف موضوعات پر نو نظمیں ہیں، کمپیوٹر، بلبل اور دوست کی امداد وغیرہ بہت ہی پیاری نظمیں ہیں، بچے واقعی اس طرح کی نظموں کو پڑھ کر خوش ہوتے ہیں۔ عبدالودود انصاری کا انٹرویو بہت اہم ہے اور انہوں نے بہت صحیح کہا کہ نئے قلمکار پیدا کرنے کی ضرورت ہے، اس لیے کہ بچوں کے لیے لکھنے والے بہت کم ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ لوگوں کو اس طرف راغب کیا جائے کہ وہ بچوں کے لیے ان کی نفسیات کو سامنے رکھ کر لکھیں۔ آٹھ کہانیاں شامل کتاب ہیں۔ روٹیوں کا جلسہ پڑھ کر بہت مزہ آیا، اس طرح کی کہانیوں سے بچے اور بڑے دونوں لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ بچوں کا باکمال شاعر، بال سبھا، ڈیجیٹل جنگل،

ای بی کے ہائی اسکول ٹیمبھور رانی ضلع جالنہ مہاراشٹر کے بچے بچوں کی دنیا کا مطالعہ کرتے ہوئے

موبائل فون اور چمن چمن کے پھول بھی پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ایک گزارش ہے کہ سائنسی مضامین کو زیادہ جگہ دی جائے اس لیے کہ بچے کو اس سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ مجموعی طور پر بچوں کی دنیا اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔

حذیفہ شمیم، رہوا، وارث نگر، سمستی پور۔848133 (بہار)

میں 'بچوں کی دنیا' کا مطالعہ بڑی گہرائی سے کرتا ہوں۔ میرے ساتھ ساتھ میرے گھر کے سبھی افراد بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ رسالے میں بہت اچھی اچھی معلومات آتی ہیں وہ باتیں بھی آتی ہیں جو ہم اسکول یا کالج میں بھی نہیں پڑھ پائے تھے نہ سن پائے تھے۔

سائنس کی معلومات بھی بہت اچھی ہوتی ہیں، ہدایتیں بھی بہت اچھی رہتی ہیں شاعری میں انتخاب بھی آپ کا بہت اچھا ہوتا ہے۔ گیت نظمیں اور موسم کے حساب میں بچوں اور بڑوں کے لیے بہت اچھا کلام ہوتا ہے۔ میں بارگاہِ رب العزت میں دعا گو ہوں کہ مالک اس رسالے کو اسی طرح ہر دلعزیز بنائے رکھے۔ بچوں کے ساتھ ساتھ بڑے بوڑھے بھی اسے خوب گہرائی سے پڑھتے رہیں۔

فیض رتلامی، 48، سمتا نگر (آنند کالونی)، رتلام، مدھیہ پردیش

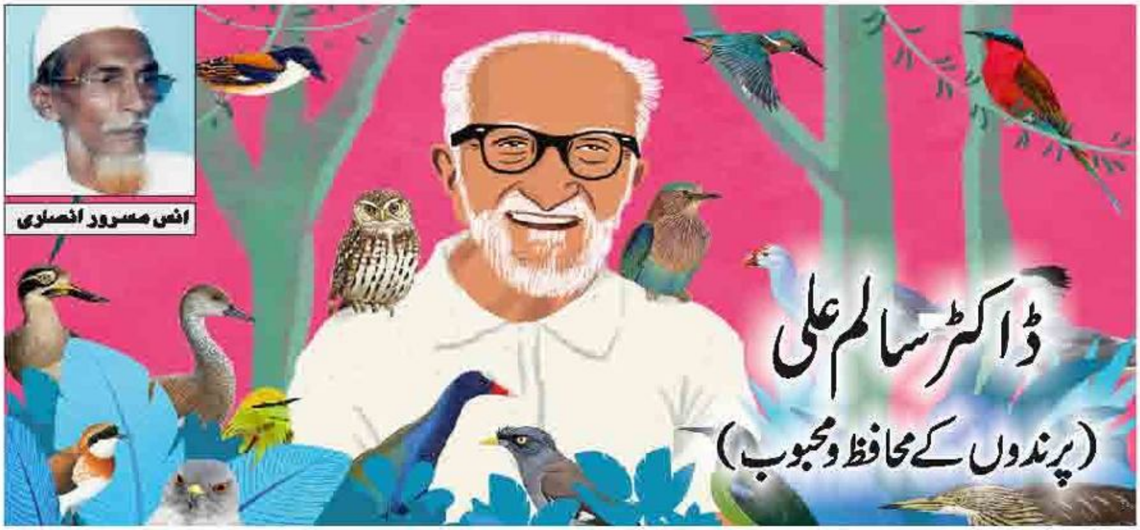

انس مسرور انصاری

ڈاکٹر سالم علی

(پرندوں کے محافظ ومحبوب)

ہندوستان میں ہمیشہ سے ایسے بڑے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں جن کے ذکر کے بغیر اس ملک کی تاریخ نامکمل رہے گی۔ انھیں میں سے ایک ڈاکٹر سالم علی ہیں جنھیں برڈس مین Bird's Man کہا جاتا ہے۔ پورا نام سالم معزالدین عبدالعلی ہے۔ دنیا انھیں سالم علی کے نام سے جانتی ہے۔ 12 نومبر 1896 میں ممبئی کے کھیت واڑی میں پیدا ہوئے۔ وہ بچپن ہی سے کھلے ماحول میں گھومنے پھرنے کے شوقین تھے۔ اپنی عمر کا زیادہ حصہ انھوں نے فطرت کی دنیا کے معصوم اور خوبصورت پرندوں کی تلاش وتحقیق میں گزارا۔ وہ تمام عمر طرح طرح کی اقسام اور خصوصیات کے پرندوں کا پتا لگاتے رہے۔ یہ کام نہایت مشکل اور دشوار ترین تھا۔ لیکن سالم علی زندگی بھر پوری لگن، ایمان داری اور مکمل یک سوئی کے ساتھ اُس کام میں مصروف رہے اور ان کی بے پناہ محنتوں کا یہ نتیجہ تھا کہ ساری دنیا نے انھیں پرندوں کا عظیم محقق اور محافظ تسلیم کیا۔ دنیا میں پرندوں کی موجودہ نسلوں کا پتا چلانے کے لیے وہ دنیا کے گوشہ گوشہ میں گھومتے پھرتے رہے اور خصوصاً ہندوستان کا چپہ چپہ چھان مارا۔ ان کی عمر کا ایک بڑا حصہ انسانی آبادی سے دور جنگلوں اور ویرانوں میں بسر ہوا۔ انھوں نے اپنی اس غیر معمولی تلاش وتحقیق کی خاطر زندگی کی راحت وآرام کو قربان کردیا جو دنیا کے بڑے بڑے شہروں میں لوگوں کو حاصل ہیں۔ اُن کی قربانیوں اور درویشانہ وقلندرانہ زندگی کے طور طریقوں اور پرندوں جیسی معصومیت اور سادگی کی وجہ سے دنیا نے انھیں سرآنکھوں پر بٹھایا۔ انھیں ہندوستان کا ایک عظیم سپوت مانا گیا۔ انھوں نے اپنے ملک کا نام اونچا کیا اور یورپ کے فطرت پرستوں کو اپنے کام کے میدان میں پیچھے چھوڑ دیا۔

سب سے پہلے انھیں ایک گوریّا نے اپنی طرف متوجہ کیا۔ ایک دن پیڑ پر انھوں نے ایک عجیب قسم کی گوریا دیکھی جس کی گردن پر پیلے رنگ کے دھبّے تھے۔ انھوں نے اسے مار گرایا اور بار بار اُسے بغور دیکھتے اور سوچتے رہے کہ یہ کس ذات کی گوریا ہوسکتی ہے۔ عام طور سے اس طرح کی گوریّا دیکھنے کو نہیں ملتی۔ جب کچھ سمجھ میں نہ آیا تو اپنے ماموں کے پاس گئے اور اُس گوریّا کے بارے میں اُن سے طرح طرح کے سوالات کیے۔ اُن کے ماموں کوئی تسلی بخش جواب تو نہ دے سکے، لیکن بھانجے کے تحقیقی ذوق کو دیکھتے ہوئے اپنے ایک ملنے والے میلارڈ صاحب کے پاس لے گئے۔ اُن دنوں میلارڈ صاحب ممبئی کی نیچرل ہسٹری سوسائٹی کے سکریٹری

تھے۔ سالم علی نے اُن سے بھی طرح طرح کے سوالات کیے۔ پرندوں کے بارے میں ایک ہندوستانی بچے کے اندر غیر معمولی دل چسپی دیکھ کر وہ حیرت میں پڑ گئے۔ وہ سالم علی کو ساتھ لے کر اپنے خاص کمرے میں گئے، جہاں مختلف قسم کے پرندوں کے بے جان جسم رکھے ہوئے تھے۔ انھیں دیکھ کر سالم علی کا اشتیاق اور بڑھ گیا۔ ڈاکٹر میلارڈ نے ایک الماری میں سے ویسی ہی ایک گوریا نکالی جیسی سالم علی کے پاس تھی۔ اس کی گردن پر بھی پیلے رنگ کے دھبّے تھے۔ انھوں نے وہاں قسم قسم کے پرندوں کو دیکھا، اور حیرت زدہ رہ گئے۔ اس سے پہلے اُنھوں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ دنیا میں اتنے قسم کے پرندے ہوتے ہیں۔ پرندوں سے ان کی دل چسپی بڑھتی چلی گئی۔ سالم علی کی حیرت اور اشتیاق کو دیکھ کر ڈاکٹر میلارڈ نے انھیں روزانہ میوزیم آنے اور پرندوں کو دیکھنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ سالم علی روزانہ میوزیم میں آنے جانے لگے۔ اُن کی جانکاری میں اضافہ ہوتا گیا۔ کچھ دنوں بعد ڈاکٹر میلارڈ نے انھیں پرندوں کے جسم کو محفوظ طریقے سے رکھنے کی ترکیب بھی بتادی۔

جب سالم علی جوان ہوئے تو اپنے بڑے بھائی کی مدد کے لیے برما (میانمار) چلے گئے۔ وہاں اپنے بھائی کے وال فریم مائننگ کے کاروبار میں مدد کرتے رہے، لیکن جنگلوں میں وال فریم تلاش کرنے کے بجائے وہ پرندوں کی تلاش اور اُن کے مطالعے میں مصروف رہنے لگے۔ بھائی نے کاروبار میں اُن کی دل چسپی کو نہ دیکھ کر انھیں 1920 میں ممبئی روانہ کر دیا۔ واپس آ کر اُنھوں نے علم حیوانیات (زولوجی) میں ایک کورس کیا اور اُسی نیچرل ہسٹری سوسائٹی میں گائڈ ہو گئے۔ میوزیم میں اُن کا کام یہ تھا کہ وہاں آنے والے سیاحوں کو محفوظ رکھے گئے پرندوں کو دکھائیں اور اُن کے بارے میں معلومات فراہم کرائیں۔ ایسا کرتے وقت بار بار اُن کے دماغ میں یہ بات آتی کہ پرندوں کے بارے میں پوری جانکاری تبھی حاصل ہو سکتی ہے جب اُن کے رہن سہن اور طور طریقوں کو بہت قریب سے دیکھا اور محسوس کیا جائے۔ چنانچہ وہ جرمنی چلے گئے، جہاں مشہور ماہر پرندارون اسٹراس مین (Irvinstrassman) کی قربت حاصل ہوئی۔ ایک سال بعد بہت کچھ سیکھ اور جان کر جب وہ ممبئی واپس آئے تو اُن کی گائڈ کی نوکری ختم ہو چکی تھی، کیونکہ میوزیم میں آمدنی کم اور خرچ زیادہ تھا۔ سالم علی کو نوکری کی سخت ضرورت تھی۔ اُن کی شادی ہو چکی تھی۔ ماہم میں اُن کی بیوی تہمینہ علی کا ایک چھوٹا سا مکان تھا، جہاں وہ دونوں رہنے لگے۔ ہندوستان میں پرندوں کی سائنس اپنے ابتدائی مرحلہ میں تھی۔ اس سے کمائی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے سالم علی کو دس سال تک تنگ دستی کی مصیبت جھیلنی پڑی۔ ان دس سالوں میں ہر مشکل کا سامنا کرتے ہوئے اُنھوں نے اپنے کام کو جاری رکھا۔

1930 میں پرندوں کی شناخت اور عادات واطوار کے متعلق ایک مضمون نے اُن کی قسمت بدل دی۔ جنگلوں اور ویرانوں میں قسم قسم کی چڑیوں کا مطالعہ کرتے ہوئے وہ اپنی معلومات کو ایک نوٹ بک میں لکھتے رہتے تھے۔ انھیں تجربات ومشاہدات کو انھوں نے کتابی شکل دی جو "دی بک آف انڈین برڈس" کے نام سے 1941 میں شائع ہوئی۔ اُس کتاب کی اب تک 65 ہزار سے زائد کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں۔ اس کتاب کی بڑی اہمیت اور افادیت ہے۔

1948 میں پرندوں کے ماہر ڈاکٹر ڈِنول رِپلے کے ساتھ مل کر سالم علی نے ہندوستان اور پاکستان کے پرندوں کے بارے میں ایک کتاب 'ہینڈ بک آف دی برڈس آف انڈیا اینڈ پاکستان' دس جلدوں میں شائع کروائی جو اپنے موضوع پر

ایک انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اس کتاب میں تمام طرح کی چڑیوں، اُن کی عادتوں، طور طریقوں اور نقل مکانی کرنے والے مہاجر پرندوں کے بارے میں تفصیل درج ہے۔ ان کتابوں کے علاوہ اُنھوں نے اپنی زندگی کے واقعات ومشاہدات کو ایک مشہور کتاب 'دی فال آف اے اسپیرو' میں بیان کیا ہے۔ اپنی زندگی کے 65 سال پرندوں کے مطالعے میں بسر کیے جس کے اعتراف کے طور پر اُنھیں پانچ لاکھ روپے کا بین الاقوامی انعام ملا۔ انعام کی رقم اُنھوں نے اُسی نیچرل ہسٹری سوسائٹی کو نذر کر دیا جس میں اُنھوں نے بطور گائڈ کام کرنا شروع کیا تھا۔

سالم علی ممبئی سے 120 کلومیٹر دور سمندر کے ساحل پر علی باغ کے پاس واقع اپنے ایک مکان میں اکثر قیام کرتے تھے۔ اُن کی خدمات کی وجہ سے حکومت نے انھیں راجیہ سبھا کا ممبر بنا دیا تھا۔ وہ عمر کے آخری ایام میں بھی پرندوں کی شناخت وتلاش اور دریافت کے کاموں میں مصروف رہے۔ انھیں پرندوں کا محسن اور محافظ بھی کہا جاتا ہے۔

ان کا زیادہ تر قیام نیچرل ہسٹری سوسائٹی کے احاطہ میں ایک فلیٹ میں رہا۔ یہ مقام نہایت پُر فضا تھا اور ہر طرف درختوں اور چڑیوں سے گھرا ہوا تھا، لیکن عمر کے آخری دنوں میں اُن کو یہ مکان خالی کرنا پڑا اور وہ باندرہ میں اپنے ایک عزیز کے مکان میں جا کر مقیم ہونے پر مجبور ہوئے۔ پرندوں کی دنیا کے اس عظیم محقق کو نیچرل ہسٹری سوسائٹی کے ذمے داروں نے فطرت سے دور دھکیل کر اُن کی بیش بہا خدمات کا کوئی اچھا صلہ نہیں دیا۔ آخری دنوں میں انھیں یہ دکھ تھا کہ وہ ٹریفک کے ہجوم اور فلک بوس عمارتوں کے قید خانے میں فطرت کے نظاروں سے محروم ہو گئے ہیں اور اب عمر نے انھیں اس لائق بھی نہیں رکھا تھا کہ وہ اپنی عزیز ترین موٹر سائیکل چلا کر جنگلوں کی راہ لے سکیں اور 'مراد منزل' پہنچ سکیں جہاں آخری دس کلومیٹر کا سفر صرف موٹر سائیکل پر کیا جا سکتا تھا۔ گلی اور پگڈنڈی نما راستوں اور جنگلوں سے ہو کر جب ایک ریتیلے ساحل پر آدمی پہنچتا ہے تو 'مراد منزل' کی جھلک نظر آتی ہے۔

ڈاکٹر سالم علی کی اُس پر فضا قیام گاہ کے اردگرد کا ماحول کس قدر دل کش اور کتنی فطری سادگی اور حسن سے بھرپور ہے، اس کو بیان نہیں کیا جا سکتا۔ 'مراد منزل' میں ایک طرف ناریل کے درختوں اور دوسری جانب طرح طرح کے جنگلی پیڑوں کی قطاریں ہیں۔ قریب ہی سمندر کی پُر شور موجیں طوفان اُٹھاتے ہوئے ایک عجیب خوبصورت سماں پیدا کرتی ہیں۔ لگتا ہے جیسے یہ جگہ فطرت نے انھیں ان کی خدمات کے اعتراف میں بطور تحفہ پیش کیا ہو۔

جب انھوں نے 'بابوئی' پرندے کے بارے میں دنیا کو

ڈاکٹرسالم علی کی اُس پرفضاقیام گاہ کے اردگرد کا ماحول کس قدردل کش اورکتنی فطری سادگی اور حسن سے بھرپور ھے، اس کو بیان نھیں کیاجاسکتا۔ 'مرادمنزل' میں ایک طرف ناریل کے درختوں اوردوسری جانب طرح طرح کے جنگلی پیڑوں کی قطاریں ھیں۔ قریب ھی سمندر کی پُرشور موجیں طوفان اُٹھاتے ھوئے ایک عجیب خوبصورت سماں پیداکرتی ھیں۔ لگتاھے جیسے یہ جگہ فطرت نے انھیں ان کی خدمات کے اعتراف میں بطور تحفہ پیش کیاھو۔

سائنٹفک طور سے معلومات بہم پہنچائیں تو لوگ حیرت میں پڑ گئے۔ لیکن 'مراد منزل' میں رہنے والے سالم علی کے لیے یہ سب کچھ فطرت نے آسان بنا دیا تھا۔ اپنی زندگی کے آخری دور میں سالم علی کافی مطمئن تھے کہ اُنھوں نے پرندوں پر تنِ تنہا مدّتِ دراز تک جو کام کیا ہے اُس کو آئندہ جاری رکھا جاسکے گا۔ اُن کے خیال میں ہندوستان پرندوں کے لیے محفوظ ترین ملک ہے۔ اس ملک کے لوگ فطری طور پر پرندوں کے شیدائی ہیں اور ان سے محبت کرتے ہیں۔ ملک کی بہت بڑی آبادی پرندوں سے طرح طرح کے شگون لیتی ہے۔ ان سے دل بہلاتی ہے اور اُن کو مارنا یا ستانا بڑا پاپ اور عظیم گناہ سمجھتی ہے۔ البتہ اُنھیں اس بات سے بے حد تکلیف تھی کہ جنگلوں کو تیزی سے کاٹا جارہا ہے اور اس کی وجہ سے پرندے اپنے آشیانوں سے محروم ہوتے جارہے ہیں۔ انھیں دکھ تھا کہ چند سال پہلے جن پرندوں کو وہ باندرہ میں دیکھ لیا کرتے تھے، اب وہ سب نایاب ہو گئے ہیں۔ اس لیے کہ اب وہاں سوائے سیمنٹ اور کنکریٹ کے جنگل کے کچھ اور بچا ہی نہیں ہے۔ وہ یورپ کے نوجوانوں کی اس خوبی کی تعریف کرتے تھے کہ وہ الگ الگ پرندوں کے انڈے جمع کرتے ہیں، کھانے کے لیے نہیں بلکہ حفاظت اور نمائش کے لیے، لیکن ہندوستان میں اس طرح کا شوق کسی میں نہیں۔

ڈاکٹر سالم علی نے جب ساٹھ ستر سال پہلے پرندوں کا مطالعہ شروع کیا تھا تو اس وقت یہ کوئی سنجیدہ موضوع یا پیشہ نہیں تصور کیا جاتا تھا۔ ان کی خوش نصیبی تھی کہ انھیں پنڈت جواہر لال نہرو جیسا قدرداں ملا، جس نے اس معاملہ میں ان کی کافی مدد کی۔ ان کے بعد مسز اندرا گاندھی کے دور میں بھی ریاستی حکومتوں اور مرکز نے اُن کی کافی حوصلہ افزائی کی۔

ڈاکٹر سالم علی کے مزاج میں بڑی انکساری تھی۔ وہ اپنے غیر معمولی کارناموں کو خود کوئی غیر معمولی بات نہیں سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انھوں نے صرف ان معلومات میں کچھ اضافہ کر دیا ہے جو ان سے پہلے کے ماہرین نے حاصل کی تھیں۔ وہ اپنی خدمات کے لیے کسی طرح کے خطاب، اعزاز اور شہرت کے طالب نہ تھے۔

امریکہ، برطانیہ اور سویت یونین میں مہاجر پرندوں کے بارے میں خاصا مطالعہ پچھلے ایک سو سال میں ہوا ہے اور ہندوستان میں اس طرح کا مطالعہ 1920 سے شروع کیا جاسکا۔ اس مطالعے سے بہت سی دلچسپ معلومات دنیا کو حاصل ہوئی ہیں۔

ان کا تعلق سلیمانی بوہرہ فرقہ سے تھا۔ وہ ایک انسان دوست، امن پسند اور خوش اخلاق آدمی تھے۔ انھوں نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا دنیا بھر سے منوایا۔ کسی قوم میں اس طرح کے افراد سے پوری ملت کے اعزاز و اکرام میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

بھارت سرکار نے ملک کے لیے ان کی خدمات کے اعتراف میں 1976 میں انھیں 'پدم بھوشن' اور اس کے بعد 'پدم وبھوشن' اور 1983 میں جنگلی جانوروں کے محافظ کا خطاب عطا کیا۔ اکیانوے سال کی عمر میں 20 جون 1987 کو وہ اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے۔

دنیا بھر کے لوگوں نے دل کی گہرائیوں سے انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا۔ ہمارے ملک ہندوستان کے لیے وہ باعثِ افتخار ہیں۔

(تعارف فروری 2021 کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے)

■

Anas Masroor Ansari
Qaumi Urdu Tahreek Foundation
Sakrawal Urdu Bazar, Tanda
Ambedkar Nagar- 224190 (UP)
Mo.: 9453347784

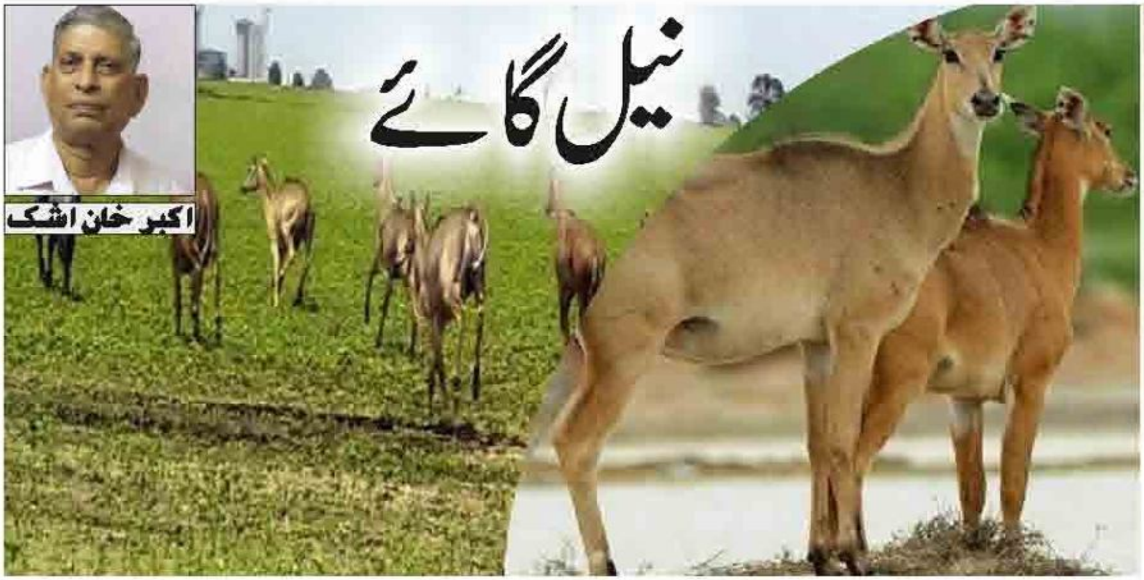

نیل گائے

اکبر خان اشک

نیل گائے ایک بڑا ہی طاقتور جانور ہے۔ قد میں نر نیل گائے گھوڑے جتنا ہوتا ہے پر اس کے جسم کی بناوٹ گھوڑے کی طرح متوازن نہیں ہوتی۔ دوسرے سینگ والے جانوروں کی طرح اسے سبک رفتاری بھی دستیاب نہیں ہے۔ اس لیے یہ شیر، چیتا اور جنگلی شکاری کتوں کا آسانی سے شکار ہو جاتا ہے، لیکن کئی بار اس کے رہنے کے لیے کھلے خشک علاقوں میں اسے کسی بھی شکاری جانور سے ڈرنا نہیں پڑتا کیونکہ وہ بغیر پانی پیے بہت دنوں تک رہ سکتا ہے جب کہ شکاری جانوروں کو روز پانی پینے کی ضرورت ہوتی ہے۔

دیکھا جائے تو نیل گائے اس جانور کے لیے اتنا بامعنی نام نہیں ہے کیونکہ مادہ بھورے رنگ کی ہوتی ہے۔ نیلا پن جوان نروں میں پایا جاتا ہے۔ وہ لوہے کی طرح سیاہی مائل رنگ کا یا نیلے رنگ کا شاندار جانور ہوتا ہے۔ اس کے آگے کے پیر پچھلے پیروں سے زیادہ طویل اور طاقتور ہوتے ہیں۔ پیٹھ پیچھے کی جانب ڈھلوان لیے ہوتی ہے۔ نر اور مادہ میں گردن پر ایال ہوتے ہیں۔

نروں کی گردن پر سفید بالوں کا ایک لمبا اور گھنا گچھا ہوتا ہے اور اس کے پیروں پر گھٹنوں کے نیچے ایک سفید دھاری دار پٹی ہوتی ہے۔ نر کی ناک سے پونچھ کے سرے تک لمبائی تقریباً 2½ میٹر اور کندھے تک کی اونچائی تقریباً ڈیڑھ میٹر ہوتی ہے۔ اس کا وزن 250 کلو تک ہوتا ہے۔ مادائیں کچھ چھوٹی ہوتی ہیں۔ صرف نروں میں چھوٹے نکیلے سینگ ہوتے ہیں جو تقریباً 20 سینٹی میٹر لمبے ہوتے ہیں۔

نیل گائے ہندوستان میں پائی جانے والی ہرن نسل کے سینگ والے جانوروں میں سب سے بڑی ہے۔ ان کے سینگ دائمی ہوتے ہیں یعنی ہرنوں کے سینگوں کی طرح ان کے سینگ ہر سال گر کر نئے پیدا نہیں ہوتے۔

نیل گائے دن کو چرنے والا چوپایہ جانور ہے۔ وہ گھاس بھی چرتی ہے اور جھاڑیوں کے پتے بھی کھاتی ہے۔ موقع ملنے پر وہ کھیتوں کی فصلوں کو بھی نقصان پہنچاتی ہے۔ اس کو بیری کے پھل کھانا بہت پسند ہے۔ زیادہ اونچائی کی ڈالیوں پر پہنچنے کے لیے وہ اپنے پچھلے پیروں پر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس کی قوت شامہ اور قوتِ باصرہ اچھی ہوتی ہے لیکن قوتِ سامعہ کمزور ہوتی ہے۔

وہ کھلے اور خشک علاقے میں رہتی ہے جہاں کم اونچائی کی کانٹے دار جھاڑیاں پھیلی رہتی ہیں۔ نشیب وفراز والے خطے میں بھی وہ گھوڑے کی طرح تیز رفتار سے اور بغیر تھکے کافی دور تک دوڑ سکتی ہے۔ وہ گھنے جنگلوں میں کبھی بھول کر بھی نہیں جاتی۔ نیل گائے راجستھان، مدھیہ پردیش کے کچھ حصوں، اتر پردیش کے دکنی علاقے بہار اور آندھرا پردیش میں پائی جاتی ہے۔ نیل گائے میں نر اور مادائیں زیادہ تر اوقات میں الگ ٹولیوں میں گھومتے رہتے ہیں۔ اکیلے گھومتے نر بھی دیکھے جاتے ہیں۔ انھیں زیادہ طاقتور نروں نے اپنی ٹولی سے نکال دیا ہوتا ہے۔ ماداؤں کے ٹولے میں بچے بھی رہتے ہیں۔

نیل گائے صرف دیکھنے میں ہی معصوم لگتی ہیں، لیکن نر بے حد جھگڑالو ہوتے ہیں۔ لڑنے کا ان کا طریقہ بھی نرالا ہوتا ہے۔ اپنی کمر کمان کی طرح اوپر کی طرف موڑ کر وہ آہستہ آہستہ ایک دوسرے کا چکر لگاتے ہوئے ایک دوسرے کے نزدیک آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قریب آنے پر وہ اگلے پیروں کے گھٹنوں پر بیٹھ کر ایک دوسرے کو اپنی لمبی اور طاقتور گردنوں سے دھکا مارتے ہیں جب کمزور نر بھاگنے لگتا ہے تو فاتح نر اپنی جھاڑو جیسی دم کو ہوا میں جھنڈے کی طرح لہراتے ہوئے اور گردن کو جھکا کر میدان چھوڑ کر بھاگتے ہوئے دشمن کے پیچھے دوڑ پڑتا ہے۔

نیل گائے بہت کم آواز کرتی ہے لیکن مادہ کبھی کبھی بھینس کی طرح رینگتی ہے۔ نیل گائے کا عمل تولید کا وقت نومبر سے جنوری کے درمیان ہوتا ہے۔ جب نروں کی نیلی رنگت والی کھال سب سے خوبصورت حالت میں ہوتی ہے۔ بچے ستمبر سے اکتوبر میں پیدا ہوتے ہیں جب گھاس کی اونچائی انھیں چھپانے کے لیے کافی ہوتی ہے۔ یہ بچے پیدا ہونے کے آٹھ گھنٹے بعد ہی کھڑے ہو پاتے ہیں۔ کئی بار جڑواں بچے پیدا ہوتے ہیں۔ بچوں کو ٹولے کی سبھی مادائیں مل کر پالتی ہیں۔ بھوک لگنے پر بچے کسی بھی مادہ کے پاس جا کر دودھ پیتے ہیں۔

نیل گائے چرتے یا ستاتے وقت بے حد ہوشیار رہتی ہے۔ آرام کے لیے وہ کھلی زمین چنتی ہے اور ایک دوسرے سے پیٹھ لگا کر لیٹتی ہے۔ یوں تو لیٹتے وقت ہر سمت میں ٹولی کا کوئی ایک ممبر نگرانی رکھتا ہے۔ کوئی خطرہ دکھنے پر وہ فوراً کھڑا ہو جاتا ہے اور دبی آواز میں پکارنے لگتا ہے۔

نیل گائے تیز گرمی بھی برداشت کر سکتی ہے۔ اسے زیادہ پانی پینے کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ اپنی خوراک سے ہی وہ ضرورت کے مطابق نمی حاصل کر لیتی ہے۔

■

Akbar Khan Ashk Jalori
Mohalla: Habshian, Fort Road
Jalor - 343001 (Rajasthan)
Mob.: 9413384093

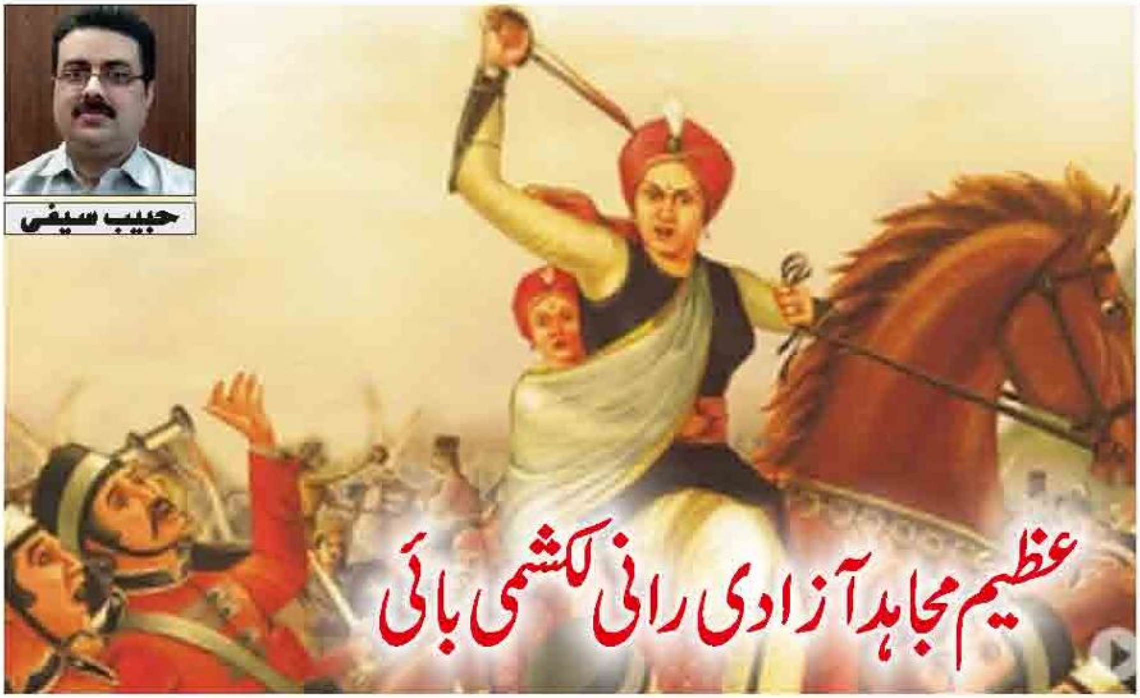

حبیب سیفی

عظیم مجاہد آزادی رانی لکشمی بائی

پیارے بچو! کیا آپ جانتے ہیں آزادی کی لڑائی میں جہاں بے شمار مرد شریک ہوئے ہیں، وہیں خواتین نے بھی آزادی کی لڑائی میں حصہ لیا ہے، لیکن کچھ ایسے بھی ہوئے ہیں جن کی بہادری وشجاعت اور معرکہ آرائی کے تذکرے تواریخ کا حصہ بن گئے۔ ملک کی آزادی کی لڑائی میں ملک وقوم نے جس جذبۂ جاں نثاری سے حصہ لیا یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہم آزاد ہندوستان میں سانس لے رہے ہیں۔ بچو! ہمارا مقصد تاریخ دہرانا نہیں بس یہ بتانا ہے کہ وطن کی سرخروئی کے لیے جو عہد کرو اسے نبھانے کی پوری ایمانداری سے کوشش کرو۔

اپنے بڑوں سے ضرور سنا ہوگا کہ وطن عزیز ہندوستان پر ایک عرصے تک انگریزوں نے حکومت کی ، ہندوستانی عوام پر ظلم وستم ڈھائے۔ ان ظالموں سے ملک آزاد کرانے کے لیے بلا تفریق مذہب وملت ہر ایک چھوٹے بڑے نے کوشش کی۔ آج ہم آپ کو بتاتے ہیں شہیدان وطن کی طویل فہرست میں ایک نام رانی لکشمی بائی کا بھی ہے۔ ان کی پیدائش 19 نومبر 1835 کو ہوئی۔ جنگ آزادی کی لڑائی کا یہ وہ دَور تھا جہاں آزادی کے جذبے کو ہندوستانی عوام نے اپنے سینوں میں دبایا ہوا تھا۔ بیشتر محاذ پر ہندوستانی حق گو انصاف پسندوں کو تعذیب کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اتر پردیش کے 'کاشی' میں پیدا ہوئی رانی لکشمی بائی کے والد کا نام مورو پنت تانبے اور والدہ کا نام بھگیرتی بائی تھا۔

رانی لکشمی بائی کے والد چکناجی اپا کے مرید تھے، جبکہ بلونت راؤ کے باجی راؤ پیشوا کے سپہ سالار تھے۔ رانی لکشمی بائی کو ان کے بچپن میں منو بائی کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ 1838 میں گنگا دھر راؤ کو جھانسی کا راجا مقرر کیا گیا، اور 1850 میں ان کی شادی یعنی منو بائی کی شادی گنگا دھر راؤ کے ساتھ ہوئی۔ 1851 میں ان کے یہاں ایک لڑکا پیدا ہوا، خوشی ومسرت سے شادیانے بجائے گئے، اتفاق سے وہ نومولود 6 ماہ بعد انتقال کر گیا۔ جھانسی میں غم کی لہر دوڑ گئی ، بیٹے کے غم سے نڈھال منو بائی (رانی لکشمی بائی) کے شوہر گنگا دھر راؤ دوبارہ صحت مند

نہ ہو سکے اور 21 نومبر 1853 کو دنیا سے رخصت ہو گئے۔ 27 فروری 1854 کو انگریزی حکومت کے لارڈ ڈلہوزی نے ماتحتی منصوبہ بندی کے تحت جھانسی کو اپنے رقبے میں ملانے کا اعلان کیا، پولیٹکل ایجنٹ کے ذریعے اطلاع ملتے ہی رانی لکشمی بائی کے منھ سے اچانک یہ جملہ ادا ہوا" میں اپنی جھانسی نہیں دوں گی۔"

7 مارچ 1854 کو جھانسی پر انگریزوں کا قبضہ ہوا، جھانسی کی رانی نے پنشن لینے سے انکار کردیا اور راج محل میں قیام کرنے لگیں۔ یہیں سے جنگ آزادی کی ایک ایسی شمع روشن ہوئی جو آزادی پانے تک کسی نہ کسی طور جلتی رہی۔ انگریزوں کے خلاف اپنی منصوبہ بندی سے رانی لکشمی بائی نے جو کامیابی پائی وہ تاریخ کا ایک حصہ ہے۔ نواب واجد علی شاہ کی بیگم حضرت محل، مغل بادشاہ کی بیگم زینت محل، بہادر شاہ ظفر، نانا صاحب کے وکیل عظیم اللہ، شاہ گڑھ کے راجا، وانپور کے راجا، مردن سنگھ، اور تانتیا ٹوپے وغیرہ نے رانی لکشمی بائی کے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہر طرح سے تعاون دینے اور ان کی کوششوں کو کامیابی سے ہمکنار کرانے کی کوشش کی۔

اس طرح رانی لکشمی بائی کی ہمت وجرأت اور بہادری کے چرچے ملک میں عام ہو چکے تھے۔ انگریز کسی محاذ پر مقابلہ آرائی یا دفاع تو کیا کرتے بلکہ اپنی جان بچانے کے لیے ہندوستانی فوجیوں کو ہی ٹکڑیوں کی شکل میں سامنے لا کھڑا کرتے۔ ہندوستان کی عظمت اور اس کی مٹی سے جو بے انتہا لگاؤ رانی لکشمی بائی کو تھا وہ بتانے کی بات نہیں۔ 31 مئی 1857 کا دن محاذ آرائی کے لیے طے کیا گیا لیکن اس سے پہلے 7 مئی 1857 کو میرٹھ میں اور 4 جون 1857 کو کانپور میں معرکہ آرائی بلا خیزی کے ساتھ ہوئی۔ 28 جون 1857 کو کانپور تو آزاد ہو گیا، انگریزوں کے کمانڈر سر ہیوروز نے اپنی فوج واپس بلا کر جنگ ختم کرنے کی کوشش کی، لیکن چال بازوں نے گڑھ کوٹا، شاہ گڑھ، مدن پور، ڈکھیڑا، وانپور اور تال بیہٹ پر اپنا قبضہ جمالیا اور ظلم وزیادتی کی انتہا کردی، رانی لکشمی بائی کے عہد شباب کے اوقات میں 1857 کی جنگ پلاسی میں ہندوستانیوں کی شکست اور انگریزوں کی فتح نے ہندوستان پر انگریزوں کے قدم مزید مستحکم کردیے اور انگریز خود مختار ہو گئے۔ اس ناکامی نے ہندوستانیوں کو مزید غلامی کی زنجیروں میں جکڑ دیا اور مختلف اذیتوں، اور ذلتوں کے شکار ہوئے۔

لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ہندوستانیوں کے دلوں اور ذہنوں میں آزادی پروان چڑھتی رہی۔ ہندوستانیوں کی روح میں تازگی، توانائی اور دل میں روز بروز نئی آرزوئیں اور امنگیں جنم لیتی رہیں، 1857 کے انقلاب کی جنگ نے ہندوستانی عوام کو غور وفکر کا ایک نیا انداز سکھایا۔ سوچنے سمجھنے کے ڈھنگ

بدلے اور سیاست بھی براہ راست متاثر ہوئی۔ کانپور کی ناکامی کے بعد انگریز فوج نے جھانسی کی جانب پیش قدمی کی اور اپنا خیمہ (کیمپ) پہاڑی کے میدان میں نصب کیا۔

رانی لکشمی بائی پہلے سے بیدار و مستعد تھیں، وانپور کے راجا مردن سنگھ سے بھی اس محاذ آرائی کے متعلق پیش رفت ہو چکی تھی، 23 مارچ 1858 کو جھانسی کی تاریخی جنگ کا آغاز ہوا۔ ذہین و ہوشیار توپچی غلام غوث خاں نے جھانسی کی رانی کے حکم کے مطابق توپوں کا نشانہ سادھ کر ایسے گولے پھینکے کہ پہلی ہی بار میں انگریزی فوج کے چھکے چھوٹ گئے۔ انھوں نے عہد کیا تھا کہ ہندوستان کی غلامی کی زنجیروں کو کاٹنے میں مجھے کامیابی ملے نہ ملے لیکن میں اپنی جھانسی پر جیتے جی انگریزوں کا قبضہ نہیں ہونے دوں گی اور بھارت میں انگریزوں کو سکون سے ایک پل بھی بیٹھنے نہیں دوں گی۔

رانی لکشمی بائی نے مکمل سات دن یعنی ایک ہفتہ بہادری کے ساتھ دفاع کیا اور اپنی چھوٹی سی ریاست کی فوج سے انگریزوں کا مقابلہ کرتے ہوئے شجاعت کا ثبوت دیا۔ تنہا اپنی پشت پر دامودر راؤ کو لے کر گھوڑے پر سوار ہو کر انگریزوں سے لوہا لیا، بہت دنوں تک اس حالت میں محاذ آرائی جاری نہیں رکھی جا سکتی تھی، اپنے سرداروں اور صلاح و مشورہ گیروں کی بات مان کر رانی لکشمی بائی نے عارضی راحت لی لیکن خاموش نہیں بیٹھیں۔

لکشمی بائی نے نانا صاحب اور ان کے سپہ سالار تانتیا ٹوپے سے رابطہ کیا اور صلاح و مشورہ کیا، رانی کی بہادری اور جذبہ وطنیت کا لوہا انگریز مان گئے، لیکن جس انگریزی حکومت اور فوج نے آزادی کی تحریک کو کچلنے کے لیے عوام اور مجاہدین پر لاٹھیاں اور گولیاں برسانے کا معمول بنا لیا تھا۔ حوصلوں کو شکست دینا انگریزوں کا مقصد تھا لیکن رانی کے آگے زیر رہی،

یہ وہ آزادیِ ہند کی لڑائی کی مجاہد خاتون تھیں جس کی ہیبت انگریزوں کے دلوں میں ایسی بیٹھی تھی کہ ان کے نام سے بھی گھبراتے تھے۔ ایک محاذ پر اسی انگریزی فوج نے رانی کا پیچھا کیا، رانی کا گھوڑا بری طرح زخمی ہوا اور وہیں ختم ہو گیا، لیکن رانی لکشمی بائی نے ہمت نہیں ہاری حوصلہ دکھایا اور عزم سے کام لیا۔ عارضی طور پر رانی لکشمی بائی اور تانتیا ٹوپے نے ایک منصوبہ بنایا اور نانا صاحب شاہ گڑھ کے راجا وانپور کے راجا، مردن سنگھ، سبھی نے رانی کا ساتھ دیا، رانی نے گوالیار پر حملہ کیا اور قلعہ پر اپنا قبضہ کر لیا۔

جیت کا جشن کئی روز چلا، لیکن رانی اس کے حق میں نہ تھیں، ان کی نظر میں یہ وقت جیت کے جشن کا نہیں بلکہ اپنے آپ کو مزید مضبوط اور مستحکم کرنے اور اگلا قدم اٹھانے کا تھا۔ انگریزی فوجی افسر سر ہیوروز اپنی فوج کے ہمراہ طاقت سے لیس ہو کر رانی کا پیچھا کرتا رہا اور آخر کار وہ دن بھی آ گیا جب گوالیار کا قلعہ گھماسان جنگ کر کے انگریزوں نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ 18 جون 1858 کو گوالیار کا آخری محاذ رانی لکشمی بائی کی زندگی کا آخری محاذ ثابت ہوا، اپنی فوج کی کمان سنبھالنے والی رانی اس جنگ میں زخمی ہو گئیں، پھر بھی غلامی قبول نہ کی اور ملک پر جان نچھاور کر دی۔ رانی لکشمی بائی نے آزادی کی لڑائی میں اپنی جان گنوا کر عوام کو سبق دیا کہ غلامی کی زندگی قبول نہ کی جائے، آزادی بڑی نعمت ہے اس کی حفاظت کی جائے۔

(تعارف مارچ 2021 کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

■

Habib Saifi
1st Floor E12/51B.Hauzrani
Malviya Nagar
New Delhi-110017

تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت پر بھی توجہ کی ضرورت ہے

س: بچپن کی کون سی باتیں اب بھی آپ کو بہت یاد آتی ہیں؟

ج: بچپن کی یادوں کو بھلانا آسان نہیں۔ امیر ہو یا غریب بچپن سب کا ہوتا ہے۔ ہر انسان کے پاس اس کے بچپن کی ان گنت کہانیاں ہوتی ہیں۔ دوستی، شرارت، کھیل کود، بے فکری اور زندگی کے سارے مزے بچپن سے عبارت ہیں۔ بچپن کے ابتدائی دور کی آوارہ گردی آج بھی مجھے یاد ہے۔ اس زمانے میں کے جی کلاس وغیرہ کا کوئی اہتمام نہیں ہوتا تھا۔ پانچ سال کی عمر میں پہلی جماعت میں داخلہ دیا جاتا تھا۔ پانچ سال کی عمر تک اپنے محلے کے بچوں کے ساتھ دھا چوکڑی، کھیل کود، گلی کوچوں میں بھٹکنا، روز روز کے لڑائی جھگڑوں کا گھر تک پہنچنا، امی کے ہاتھوں پٹائی، تتلیوں کے پیچھے بھاگنا، آم اور املی توڑنا اور باغ کے مالی کو پریشان کرنا آج بھی یاد ہے۔ جب پہلی جماعت میں داخل ہوئے تو پڑھنے لکھنے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔ دوسری جماعت تک تعلیم میں عدم دلچسپی اور شرارتوں کا سلسلہ جاری رہا، لیکن تیسری جماعت میں پہنچنے پر شخصیت میں بہت سی تبدیلیاں رونما ہونے لگیں۔ تیسری جماعت سے ہی اسٹیج پر اینکرنگ، اداکاری، اسکاؤٹ بینڈ، بانسری اور موسیقی کا شوق لگا جو ہنوز قائم ہے۔ اسی جماعت میں اساتذۂ کرام نے میری صلاحیتوں کے مطابق خوب مواقع عنایت کیے اور میری شخصیت کو سنوارنے میں اہم کردار ادا کیا۔ پنجم جماعت تک پہنچتے پہنچتے اسکاؤٹ بینڈ کا ہر ساز بجانا سیکھ لیا اور آر ایس پی گروپ کا لیڈر بن گیا۔ ہمارے گروپ نے مارچنگ کے بڑے مقابلے میں اول مقام حاصل کیا۔ اس کے علاوہ اسپورٹس کے تمام مقابلوں میں شریک ہو کر نمایاں کامیابی حاصل کرتا رہا۔ اپنے اسکول احمد سیلر اردو ہائی اسکول کی باسکٹ بال انڈر 13 ٹیم میں شامل ہو کر ٹورنامنٹ کھیلا۔ فٹ بال ٹورنامنٹ میں اپنی محلہ ٹیم کے سینٹر فارورڈ کھلاڑی کی پوزیشن پر ٹورنامنٹ کھیلا۔ بچپن میں کرکٹ بھی بہت کھیلی۔ کئی برسوں تک ہر جمعہ اور اتوار کو کرکٹ میچ کھیلتا تھا۔ اپنی کرکٹ ٹیم کا اہم رکن تھا۔ کیرم بورڈ اور شطرنج کھیلنے کا بھی بہت شوق تھا۔ میں نے بچپن میں ہی پڑھائی میں اول مقام حاصل کرنے کا عزم کر لیا تھا۔ میں سالانہ امتحان میں تیسری جماعت سے ہی ہر سال پہلا نمبر حاصل کیا۔ ہر مضمون میں خوب دلچسپی لیتا تھا۔ پڑھائی کے وقت پڑھائی اور کھیل کے وقت کھیل کے اصول پر سختی سے عمل کرتا تھا۔ آج کا کام کل پر کبھی نہیں ٹالتا تھا۔ ہر سال اپنی جماعت کا مانیٹر ہونے کی وجہ سے، بہت ذمے داری سے اپنا ہر کام سب سے پہلے اور وقت پر مکمل کرنے کی عادت اپنائی تھی۔ بچپن سے ہی اچھے اصولوں پر سختی سے عمل کرنے کی عادت کے

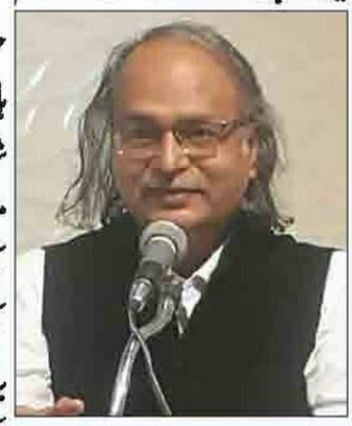

رفیق گلاب

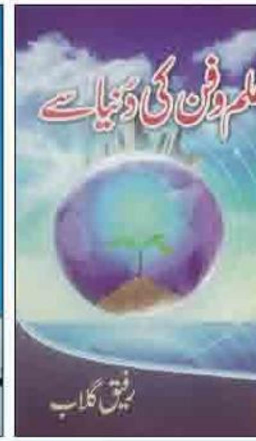

رفیق گلاب کی کتابوں کا عکس

باعث کھیل کود اور تعلیم، دونوں شعبوں میں کامیاب رہا۔ بچپن سے مجھے ہر جماعت میں بہت ہی مخلص اساتذۂ کرام ملتے گئے اسی لیے انتہائی غریبی کے باوجود میرا بچپن بہت ہی شاندار گزرا۔ جس کے لیے میں اللہ رب العزت کا بے حد شکر گزار ہوں۔

س: بچپن میں آپ کے پسندیدہ مصنفین کون تھے اور آج کون ہیں؟

ج: بچپن میں مجھے بال بھارتی اردو درسی کتاب کے اسباق بہت پسند تھے۔ اس وقت مصنفین کے ناموں کی طرف توجہ نہیں جاتی تھی۔ درسی کتاب کی کہانیاں، نظمیں، ڈرامے شوق سے پڑھتا تھا اور بار بار پڑھتا تھا۔ مصنف اور شاعر کے نام پر کبھی کبھی نظر پڑتی تھی۔ کچھ نام یاد ہیں۔ جیسے اسماعیل میرٹھی، ڈاکٹر ذاکر حسین، شفیع الدین نیر، افسر میرٹھی، مولانا الطاف حسین حالی، نظیر اکبرآبادی، پریم چند اور کرشن چندر وغیرہ۔

آج بچوں کے ادب کے لیے کام کرنے والے سبھی قلمکار میرے پسندیدہ ہیں۔ آج کے مصروف ترین دور میں بچوں کے ادب کے لیے وقت نکالنا اپنے آپ میں بہت ہی قابل قدر عمل ہے۔

س: بچپن میں کس کتاب نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا؟

ج: بچپن میں مجھے اردو بال بھارتی درسی کتاب نے سب سے زیادہ متاثر کیا۔ ہر سال نئے نئے دلچسپ اسباق کے ساتھ درسی کتاب پڑھنے کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ اسی کتاب نے اردو پڑھنا لکھنا سکھایا۔ اردو زبان وادب سے روشناس کرایا۔ اسی کتاب نے اردو کی شیرینی کا مزہ چکھایا۔ اسی کتاب نے مادری زبان اردو سے محبت کرنا سکھایا۔

س: بچپن میں آپ کون سے رسائل پڑھتے تھے؟

ج: کھلونا اور پیام تعلیم

س: بچوں کے ذہنی اور فکری ارتقا کے لیے کون سی کتابیں زیادہ مفید ہیں؟

ج: بچوں کے ذہنی اور فکری ارتقا کے لیے بچوں کے رسالے بہت مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ اخبارات میں بچوں کے لیے شائع ہونے والے خصوصی صفحات ان کی شخصیت سازی کے لیے بہت کارآمد ہیں۔ سائنس داں، سماجی مصلحین، مفکرین اور علم وادب سے وابستہ شخصیات کی کامیاب زندگی کی کہانیاں یا سوانح عمری پر مشتمل کتابیں۔ ہر وہ کتاب بچوں کے لیے مفید ہے جو ان کے ذہنی اور فکری ارتقا کے مقصد سے شائع کی گئی ہو۔

س: زبان وبیان کو بہتر بنانے کے لیے کن مصنفین کی کتابیں بچوں کے لیے بہتر ثابت ہوسکتی ہیں؟

ج: زبان وبیان کو بہتر بنانے کے لیے بچوں کے ادب کی ہر کتاب مفید ثابت ہو سکتی ہے لیکن میری نظر میں بچوں کی اردو درسی کتاب سب سے عمدہ کتاب ہے۔ درسی کتاب سے بچوں کو والہانہ لگاؤ ہوتا ہے۔ درسی کتاب میں نئے پرانے مصنفین کی عمدہ تخلیقات شامل کی جاتی ہیں۔ درسی کتاب میں شامل

اسباق کے مصنفین سے تعارف کے بعد بچوں کو ان سے انسیت ہو جاتی ہے۔ ان مصنفین کی کتابوں کو بچے شوق سے پڑھتے ہیں۔ تحریر وتقریر، قواعد، تلفظات اور زبان وبیان سب کچھ بچے درسی کتاب سے ہی سیکھتے ہیں۔

س: مستقبل اور اپنے کریئر کو سنوارنے کے لیے بچوں کو کن موضوعات اور کتابوں کا مطالعہ کرنا فائدہ مند ثابت ہو سکتا ہے؟

ج: مختلف زبانوں میں کئی رسالے شائع ہوتے ہیں۔ کیریئر گائیڈینس کے موضوع پر بازار میں بہت سی کتابیں دستیاب ہیں۔ اسکول لائبریری میں بھی مذکورہ موضوعات پر کتابیں ذخیرہ کی جاتی ہیں۔ اخبارات اور رسائل میں پابندی سے کیریئر گائیڈینس پر عمدہ معلومات فراہم کی جاتی ہیں۔ بچے ان تمام ذرائع سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

س: اپنے سوانحی اور تعلیمی کوائف کے بارے میں کچھ بتائیں۔

ج: میری پیدائش 10 مئی 1969 کو مہاراشٹر کے شہر احمد نگر کے تعلقہ شری رامپور میں ہوئی۔ پیدائش کے چند برسوں بعد میرا خاندان ممبئی منتقل ہو گیا۔ میری ابتدائی تعلیم فاروقیہ میونسپل ایڈیڈ اردو پرائمری اسکول ممبئی میں ہوئی۔ انجمن اسلام احمد سیلر اردو ہائی اسکول ممبئی سے 1986 میں دسویں جماعت کا امتحان امتیازی نمبروں سے کامیاب کیا۔ آرسی ماہم ڈی ایڈ کالج ماہم ممبئی سے 1988 میں درس وتدریس کا ڈپلومہ حاصل کیا۔ اس کے بعد اعلی تعلیم کے لیے ممبئی کے مشہور کالج مہاراشٹرا کالج میں داخلہ لیا۔ گریجویشن کے پہلے ہی سال مہاراشٹرا کالج میں شاندار اردو ہفتہ منایا گیا۔ اردو ہفتہ کے سبھی مقابلوں میں حصہ لیا اور زیادہ تر مقابلوں میں امتیازی کامیابی کے باعث بہترین طالب علم کے اعزاز سے نوازا گیا۔ تین برسوں تک کالج کے سبھی ڈراموں میں مرکزی کردار ادا کیا۔ کالج کے دور میں بطور اداکار اور گلوکار خوب شہرت حاصل کی۔ بزم اردو مہاراشٹرا کالج کے جنرل سکریٹری اور آخری سال چیرمین کے عہدہ پر فائز رہا۔ 1990 میں بی ایم سی میں درس وتدریس کے پیشہ سے وابستہ ہوا۔ اسی کے ساتھ سیکھنے سکھانے کے نئے دور کا آغاز ہوا۔ بچوں کی معصوم دنیا میں 33 برس گزار چکا ہوں۔ بچوں کے لیے ڈرامے لکھتا ہوں۔ ان سے اداکاری کرواتا ہوں۔ ان پیارے پیارے بچوں نے مجھ سے خوب ڈرامے لکھوائے ہیں۔

گذشتہ تیس برسوں میں معصوم بچوں کی دعاؤں سے میرے ڈراموں کو خوب پذیرائی حاصل ہوئی۔ ہر مقابلے میں اول، دوم اور سوم انعامات سے نوازا گیا۔ بیشتر مقابلوں میں مجھے بہترین مصنف اور ہدایت کار کے انعام کا حقدار قرار دیا گیا۔ میرے ڈراموں کو کئی اسکولوں کے سالانہ جلسوں میں خصوصی سرگرمی کے طور پر کھیلا گیا۔ بچوں کے لیے تحریر کردہ ڈراموں کے مجموعے 'آؤ چاند پر چلیں' کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکادمی نے اس کتاب کو انعام سے نوازا۔ چند برسوں بعد اس کتاب کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا۔ بچوں کے ادب میں خدمات کو دیکھتے ہوئے روزنامہ اردو ٹائمز ممبئی نے تعلیمی صفحہ 'عزائم' ترتیب دینے کا موقع فراہم کیا۔ اردو ٹائمز نے بچوں کے لیے ریاستی سطح کے ڈرامہ مقابلے کا انعقاد کیا تھا۔ اس موقع پر مجھے بچوں کے لیے طویل مدت تک ڈرامہ نگاری کے لیے لائف ٹائم اچیومینٹ ایوارڈ سے نوازا گیا۔ روزنامہ اردو ٹائمز میں ہفت روزہ ضمیمہ 'عزائم' کی ادارت کے ساتھ ساتھ کالم 'علم وفن' تحریر کرنے کا موقع ملا۔ اس کالم میں شائع ہونے والے مضامین کے مجموعے 'علم وفن کی دنیا سے' کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زباں کے مالی تعاون سے شائع کیا گیا۔ اس کتاب کو بھی مہاراشٹرا اسٹیٹ اردو اکادمی نے انعام سے نوازا۔ اس کے علاوہ ڈرامہ 'ہم کہاں جا رہے ہیں' کو بھی اردو اکادمی نے انعام سے نوازا۔ قومی کونسل کے زیر اہتمام منعقدہ

کتاب میلے میں میرے تین ڈرامے 'ہمیں پڑھنے دو'، 'شہر سے اپنا جنگل اچھا' اور 'ٹریفک سگنل' کو پیش کرنے کا موقع ملا۔ اردو اکادمی نے ساحر لدھانوی ایوارڈ سے نوازا۔ درس وتدریس کے لیے بی ایم سی نے میئر ایوارڈ سے نوازا۔ ملک کے بیشتر اخبارات اور رسائل میں میری تخلیقات شائع ہوئیں۔ گذشتہ پچیس برسوں سے آل انڈیا ریڈیو کے پروگرام پھلواری میں بچوں کے لیے پروگرام پیش کر رہا ہوں۔ حصول تعلیم کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ اردو میں ایم اے کرنے کے بعد چند برس پہلے مراٹھی زبان میں ایم اے کی ڈگری حاصل کی ہے۔ بطور اداکار چند شارٹ فلموں میں مرکزی کردار ادا کرنے کا موقع ملا۔ علمی، ادبی، تعلیمی اور موسیقی کے بیشتر پروگراموں میں اینکرنگ کی خدمات انجام دیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے بطور اداکار، گلوکار اور اینکر خوب عزت اور شہرت سے نوازا ہے۔

س: آپ کو بچوں کے لیے لکھنے کا خیال کب اور کیسے آیا؟

ج: میں بنیادی طور پر اداکار ہوں۔ درس وتدریس کے پیشے سے وابستہ ہونے کے بعد مختلف ڈرامہ مقابلوں کے لیے ڈرامہ کی تلاش وجستجو کرتے کرتے ڈرامہ نگاری کا خیال آیا۔ 1990 میں بچوں کے لیے ڈرامہ نگاری شروع کی۔ جو آج بھی جاری ہے۔ بچوں کے لیے ڈراموں کا ایک مجموعہ 'آؤ چاند پر چلیں' کے دو ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ دو مجموعے 'نئی منزل کی تلاش میں' اور 'آؤ بچو! کریں ڈرامہ' اشاعت کے مراحل میں ہیں۔ بچوں کے لیے نظمیں کہنے کی کوشش کرتا ہوں کچھ نظمیں ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' میں شائع ہوئی ہیں۔ 'سنو بچو!' کے نام سے بچوں کے لیے نظموں کا مجموعہ عنقریب منظر عام پر آئے گا۔

س: آپ کی پہلی تخلیق کب اور کس رسالے میں شائع ہوئی؟

ج: میری پہلی تخلیق روزنامہ اردو ٹائمز میں شائع ہوئی۔ پہلا ڈرامہ 'ہمیں پڑھنے دو' ماہنامہ گل بوٹے ممبئی میں شائع ہوا۔

س: آپ کے مرکزی موضوعات کیا ہیں؟

ج: میں علم وادب، تعلیم وتربیت، صحت وصفائی، شخصیت سازی، ماحولیات اور سائنسی موضوعات پر ڈرامے، نظمیں اور کہانیاں تحریر کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

س: کتاب لکھنے سے پہلے آپ بچوں کی نفسیات اور ذہنی مطالبات پر ریسرچ کرتے ہیں یا نہیں؟

ج: میں کوئی بھی نظم، کہانی یا ڈرامہ لکھنے سے پہلے ذہن بنا لیتا ہوں کہ میں بچوں کے لیے لکھ رہا ہوں۔ پھر جیسا موضوع ہوتا ہے اس کے مطابق بچوں کی نفسیات اور ان کی عمر کا خیال رکھتے ہوئے واقعات قلمبند کرتا ہوں۔ لفظیات پر خصوصی توجہ دیتا ہوں۔ میری حتی الامکان یہی کوشش ہوتی ہے کہ ایسا کچھ تحریر کروں جو سیدھے بچوں کے دل میں اتر جائے۔ ان کا وقت ضائع نہ ہو اور میری تخلیق یا تحریر سے ان کی شخصیت میں مثبت تبدیلی رونما ہو۔

س: بچوں کے لیے لکھتے وقت آپ کو کس طرح کی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

ج: شروع شروع میں کافی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بچوں کے لیے لکھنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اس کارِ خیر کے لیے بچوں کی دنیا میں اترنا پڑتا ہے۔ بچوں کے لیے بچوں کا دوست بن کر لکھو تو پھر بہت سی مشکلیں آسان ہو جاتی ہیں۔

س: ادیب اطفال کی حیثیت سے ادبی اور علمی حلقوں میں آپ کی قدر ہوتی ہے یا نہیں؟

ج: الحمدللہ! بہت قدر ہوتی ہے۔ علمی وادبی اجلاس میں بچوں کے ادیب کے طور پر متعارف کرایا جاتا ہے۔ اسٹیج پر بلا کر اعزاز سے نوازا جاتا ہے۔ اگلی صفوں میں جگہ دی جاتی ہے۔

س: کیا آپ آج بھی بچوں کے لیے لکھی گئی کتابیں پڑھتے ہیں؟

ج: جی ہاں، پڑھتا ہوں۔ بچوں کے ادیب کو بچوں کا عصری

ادب پڑھنا بہت ضروری ہے۔

س: انگریزی اور دیگر زبانوں میں شائع ہونے والے کون سے رسالے بچوں کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں؟

ج: انگریزی اور دیگر زبانوں کے رسالوں سے پہلے بچوں کو اردو زبان کے رسالوں کا عادی بنانا ضروری ہے۔ مادری زبان کے رسالوں کو پڑھتے پڑھتے مطالعے کی بھوک بڑھے گی تو بچے خود ہی دیگر زبانوں کے رسالوں کی طرف متوجہ ہوں گے۔

س: کیا اردو میں بچوں کے لیے انگریزی، تیلگو اور دیگر زبانوں جیسا شائع ہونے والا کوئی مکمل رسالہ موجود ہے؟

ج: اردو میں شائع ہونے والے بچوں کے سبھی رسالے معیاری ہیں۔

س: بچوں کے ادب پر جو رسائل شائع ہو رہے ہیں ان کے مواد اور زبان و بیان سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

ج: تمام رسالے بچوں کی شخصیت سازی میں معاون ہیں۔ سبھی رسالے مواد اور زبان و بیان کے معیار کا خیال رکھتے ہیں۔

س: معاصر ادب اطفال سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

ج: میں معاصر ادب اطفال سے بہت حد تک مطمئن ہوں۔ بچوں کے ادیب عمدہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔ بچوں کے رسائل اور اخبارات میں شائع ہونے والا بچوں کا ادب اس کی عمدہ مثال ہے۔

س: بچوں کے لیے لکھتے ہوئے آج کے دور میں کن موضوعات پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے؟

ج: شخصیت سازی، وقت کی اہمیت، صحت و تندرستی، صفائی کی اہمیت، ماحولیات، حب الوطنی، ماں باپ کی خدمت، اساتذہ کا ادب، تعلیم و تربیت، سائنس اور ٹیکنالوجی، پانی کی اہمیت، پیڑ پودے، ہریالی، قدرتی نعمتیں وغیرہ۔

س: بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے کچھ مفید تجاویز اور مشورے!

ج: بچے کی ہمہ جہت ترقی کے لیے تعلیم اور تربیت دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت پر بھی توجہ کی ضرورت ہے۔ کسی ایک سے بھی لاپرواہی بچے کی شخصیت کو نقصان پہنچا سکتی ہے۔ معصوم بچوں کی تربیت شفقت اور محبت سے کی جائے۔ ان کی صلاحیتوں کے مطابق مواقع فراہم کیے جائیں۔ ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ مطالعے کا عادی بنایا جائے۔ کم از کم ایک رسالے کا خریدار بنایا جائے۔ بچپن سے ہی شخصیت سازی پر توجہ دی جائے تو یقیناً بچہ کامیاب اور اچھا انسان بن کر ملک و قوم کا نام روشن کرے گا۔

س: ماہنامہ بچوں کی دنیا میں آپ کس نوع کی تبدیلی چاہتے ہیں؟

ج: ماہنامہ بچوں کی دنیا میں شائع ہونے والے مضامین بچوں کی تعلیم و تربیت میں معاون ہیں۔ یہ ایک معیاری رسالہ ہے۔ بچوں کے ادیبوں کے انٹرویوز کا سلسلہ اچھا ہے۔ مختلف شعبوں میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے والے طلبہ کے انٹرویوز بھی شامل کیے جائیں۔ شخصیت سازی اور کیریئر گائیڈنس پر مبنی مضامین شامل کیے جائیں۔

س: بچوں کے لیے آپ کا کوئی پیغام!

ج: اپنی زندگی کو کامیاب بنانے کی ہر ممکن کوشش کریں۔ مطالعے کی عادت اپنائیں۔ اخبار بینی بہترین مشغلہ ہے۔ ہر وقت اچھے کام میں مصروف رہیں۔ صحت سب سے بڑی دولت ہے۔ اس لیے صحت کو نقصان پہنچانے والی عادتوں سے بچیں۔ ماں باپ کا ادب کریں۔ ان کی خدمت کریں اور دعائیں لیں۔ استاد کا ادب لازم ہے۔ کاہلی سے بچیں۔ اچھی زبان میں گفتگو کریں۔

■

Rafique Gulab
3/C, 102, Sarvodaya Park
Kalyan (West)
Thane - 421301 (Maharashtra)
Mob.: 9323361261

کوئی بھی کام سرسری نہ کرو

رؤف خیر

کوئی بھی کام سرسری نہ کرو
کاہلوں کی برابری نہ کرو
محنتیں روز صبح و شام کرو
خوب علم و ہنر میں نام کرو

چاہے شطرنج ہو کہ کرکٹ ہو
اپنا ہر کھیل جیتنا سیکھو
چاہے فٹ بال ہو کہ والی بال
جیتنا ہے تمھیں تو وہ ہر حال

چاہے انگریزی ہو کہ الجبرا
وہ کیمسٹری سہی، حساب سہی
جی لگا کر پڑھا کرو سب کچھ
چاہے اللہ کی کتاب سہی

سامنے ہے تمھارے کمپیوٹر
نئی دنیا کا سامنا ہے تمھیں
وقت کے ساتھ ساتھ چلنا ہے
وقت کا ہاتھ تھامنا ہے تمھیں

■

Dr. Raoof Khair
Moti Mahal, Golconda
Hyderabad-500008 (Telangana)
Cell : 9440945645

پہیلی

انصار احمد معروفی

ایک نظم، گیارہ ملک

چُھپا اس نظم میں ہے نام گیارہ ملک کا بچو!
بہت آسان ہے پا جاؤ گے ہمت کرو ڈھونڈو!
اگر عامر یکا یک مار دے ایمن کو کیا ہوگا؟
بتاؤ اس کے حق میں یہ برا یا کچھ بھلا ہوگا؟
کوئی ترکیب تم اس کے سکوں کے واسطے سوچو
بہت بے چین ہو جائے تو کس کا آسرا ہوگا؟
جو رو سکتا ہے وہ آنسو بہا کر مطمئن ہے کچھ
جو طاقتور نے پالا غم تو یہ بے حد برا ہوگا
جو ہے مصروف کاموں میں تو اس کی زندگی اچھی
کبھی لب نان کی خاطر نہ منہ اس کا کھلا ہوگا
بڑھا سکتی ہے شوبھا رت جگے کی اک تری آمد
یوں سمجھو بس تمھارے واسطے منڈپ سجا ہوگا
کسی کے سامنے کر لے بیاں دل کی اگر باتیں
کبھی بھی مسئلہ اس کا نہ کوئی مسئلہ ہوگا
بہت مشہور ہے صبحِ بنارس اور اودھ کی شام
مگر شاید بڑے ہونے پہ ان کا سامنا ہوگا
ضروری تو نہیں وہ نام تم ہر شعر میں ڈھونڈو
کہیں اِس میں چھپا ہوگا کہیں اُس میں چھپا ہوگا
اگر ہم صاف لکھ دیتے پہیلی بن نہیں پاتی
کبھی آدھا ملا ہوگا کبھی پورا کٹا ہوگا

(تعارف ستمبر 2021 کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

■

Ansar Ahmad Maroofi
Baluwa, Po: Kurthi Jafarpur
Mau - 275305 (UP),Mob.: 8853214848

نظم

التفات امجدی

اچھی بات بھلی لگتی ہے

دہقاں خوش ہیں ہریالی پر — اپنی فصل کی خوش حالی پر
اچھی بات بھلی لگتی ہے — غصہ آتا ہے گالی پر
گل کی نگرانی کرنے کی — ذمے داری ہے مالی پر
ٹوٹ پڑے ہیں بھوکے بچے — بریانی والی تھالی پر
جھومتے ہیں مستی میں بچے — قوالوں کی قوالی پر
چھت پر ہے کوؤں کی ٹولی — بندر کی ٹولی ڈالی پر
مچھر جاگیں راتوں میں بھی — دن میں ہیں سوتے نالی پر
پیسے والے کیوں ہنستے ہیں — ہم مفلس کی کنگالی پر
ہولی میں ہم گائیں پھگوا — دیپ جلائیں دیوالی پر
صوفی کی نظریں ٹھہری ہیں — ولیوں کے در کی جالی پر
جب چوری گھر میں ہوتی ہے — آنچ آتی ہے رکھوالی پر
جھوم رہے ہیں ڈیڈی ممی — بچوں کی خوش اقبالی پر
ناچ رہا ہے بھالو دیکھو — چھوٹے بچوں کی تالی پر

امجدی کی آنکھیں نم ہیں
اردو تیری بدحالی پر

(تعارف اپریل 2021 کے شمارے میں شائع ہوچکا ہے)

■

Dr. Iltefat Amjadi
Khanquah Amjadia
Station Road
Siwan - 841226 (Bihar)
Mob.: 9934497795

ڈاکٹر فہیم احمد

گڑبڑ جھالا

سب سے جدا اور البیلا
دیکھو یہ زاہد کا تھیلا

کنچے اس میں بھرے پڑے ہیں
کچھ نیلے کچھ ہرے پڑے ہیں
بھرے پڑے ہیں سکے کھوٹے
ہیں بندر کے تین مکھوٹے

ایک پرانی چابی کالی
ماچس کی ڈبی ہے خالی
چھوٹی چھوٹی کیل سوئی ہیں
محنت سے یہ جمع ہوئی ہیں

بٹن سیکڑوں رنگ رنگیلے
کاغذ بھی ہیں نیلے پیلے
تھیلا ساتھ میں رکھتا ہر دم
کچھ بھی نہ ہونے دیتا کم

خالی شیشی ٹوٹا عینک
ایک بڑا موٹا سا چنبک

بنا ٹانگ کا جوکر اس میں
بن پہیے کی موٹر اس میں

کہتی ہیں زاہد کی خالہ
تھیلا ہے یا گڑبڑ جھالا

■

Dr. Faheem Ahmad
Asst Professor, Dept of Hindi
Mahatma Gandhi Memorial (P.G. College
Chaudhary Sarai)
Sambhal - 244302 (UP)
Mob.: 8896340824

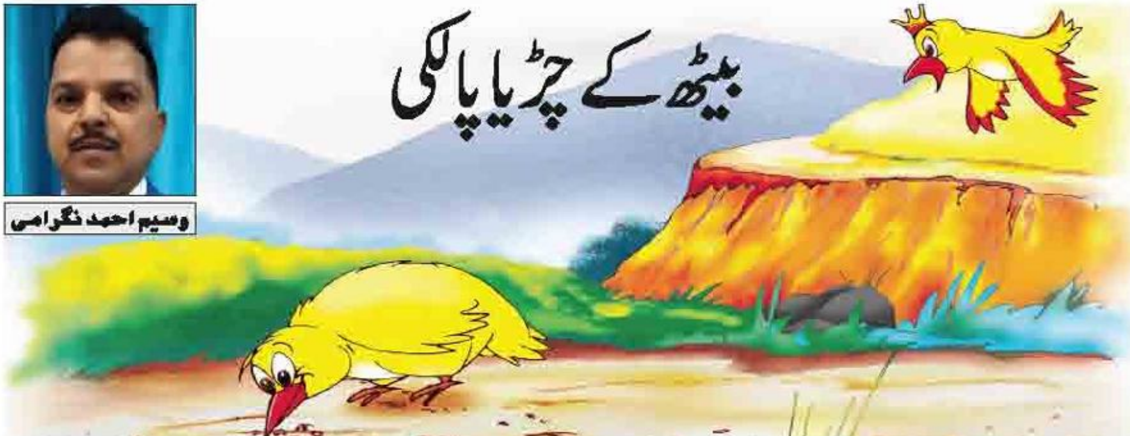

وسیم احمد نگرامی

نظم

بیٹھ کے چڑیا پالکی

بیٹھ کے چڑیا پالکی
راہ چلی سسرال کی
فکر بھی ہونے لگی اسے
ابھی سے روٹی دال کی
چڑا نہ جانے کیسا ہو
ہو کہ پاس نہ پیسہ ہو
بالکل سیدھا سادہ ہو
آلس کا شہزادہ ہو
فکر ہے چڑیا رانی کو
من میں اٹھے سوال کی
کڑھا نہ ہو تو کیا ہوگا
پڑھا نہ ہو تو کیا ہوگا
کام جو ہمت والے کرنے
بڑھا نہ ہو تو کیا ہوگا
بن پاؤں گی کیسے تب میں
قسمت اس کے بھال کی
ہمت اسے دلاؤں گی
خود بھی ہاتھ بٹاؤں گی
جہاں کام پر جائے گا
ساتھ میں اس کے جاؤں گی
ایسی جوڑی بن پائی تو
ہوگی بڑے کمال کی
ہمت ہمیں جتانا ہوگا
مل آشیاں بنانا ہوگا
کبھی نہیں ایک دوجے پر
ہم کو حکم چلانا ہوگا
بات نہیں کرنا ہے کوئی
جھگڑے اور بوال کی
بیٹھ کے چڑیا پالکی
راہ چلی سسرال کی

■

Wasim Ahmad Nigrami
R. N. J. I. College
Nagram
Lucknow - 226303
Mob.: 9198931894

جگنو

شمیم اختر

اک رات جو سویا تو مجھے نیند نہیں آئی
سوچا کہ کہاں ڈھونڈوں بڑی نیند ہے ہرجائی

کروٹ بھی بدلتے رہے دائیں تو کبھی بائیں
تاکہ کسی طرح سے کچھ پل کو ہی سو جائیں

پھر بھی نہ بنا کام تو کھڑکی کو ذرا کھولا
دادی تھی بغل میں ہی انھیں ماجرا یہ کھولا

بجلی نہیں تھی اور نہ ملتی تھی موم بتی
تاریکیاں تھی ہر سو الگ اور تھا سناٹا

تب گھر میں اچانک سے وہ جگنو کہیں سے آیا
جو نور سراپا تھا ضرورت میں جسے پایا

سوچا کہ لپک کر میں اسے جا کے پکڑ لوں گا
ظلمت کدے کو روشن اس ذات سے کرلوں گا

بڑھتے مجھے وہ دیکھ کے چوکنا ہوا ایسے
جیسے کسی کالے کے کوئی بھاگتا ہے پیسے

ہر بار ادھر سے وہ ادھر بھاگ رہا تھا جب
اس فعل کو دادی بھی مری دیکھ رہی تھی تب

کیڑا ہے اسے مٹھیوں میں پکڑو نہ ہرگز تم
آزاد ہی رہنے دو اسے جکڑو نہ ہرگز تم

دادی کی یہ باتیں مجھے اس طرح چبھیں دل پر
اپنا وہ ارادہ ہی میں نے چھوڑ دیا اختر

کھلتے ہی مرا ہاتھ کہاں اڑ گیا وہ جگنو
پر نیند مری آنکھوں میں تو بھر گیا وہ جگنو

■

Shamim Akhtar
5, PM Bustee 4th Lane, Shibpur
Howrah - 711102 (West Bengal)
Mob.: 9836225704

بشریٰ یاسمین

نظم

پیار کا گلشن

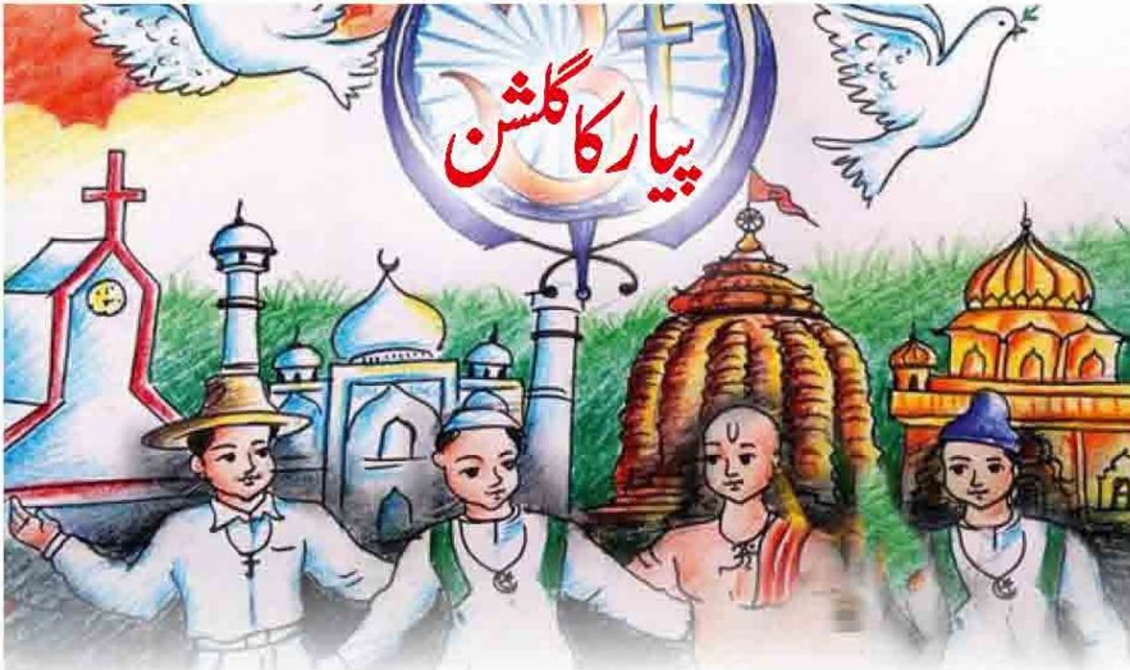

پیار کا ایک گلشن بنائیں
مل کے سب اس چمن کو سجائیں
جس میں نہ کوئی چھوٹا بڑا ہو
جس میں نہ کوئی کالا گورا ہو
نہ امیری غریبی کا ہو بھید
مل کے سب کھیلیں کودیں اور گائیں
پیار کا ایک گلشن بنائیں
مل کے سب اس چمن کو سجائیں
جس میں بچوں کو نہ کوئی ڈر ہو
اور نہ ماتھے پہ کوئی بل ہو
دل میں کینہ نہ کوئی کپٹ ہو
نفرتوں کو دل سے مٹائیں
پیار کا ایک گلشن بنائیں
مل کے سب اس چمن کو سجائیں
خواہشیں سب کی ہو جائیں پوری
کوئی خواہش رہے نہ ادھوری
جس میں ہم نہ کسی کو ستائیں
حسرتیں نہ کسی کی دبائیں
پیار کا ایک گلشن بنائیں
مل کے سب اس چمن کو سجائیں
مل کے قدرت کے سب گیت گائیں
لو بھی ہم خدا سے لگائیں
ان میں انسانیت کو جگائیں
جس میں بچے سدا مسکرائیں
پیار کا ایک گلشن بنائیں
مل کے سب اس چمن کو سجائیں

■

Bushra Yasmeen W/O Ameer Faisal (Late)
Shaikh Damupura
Mau - 275101 (UP)
Mob.: 7408984071

ایک بے سر پیر کی کہانی

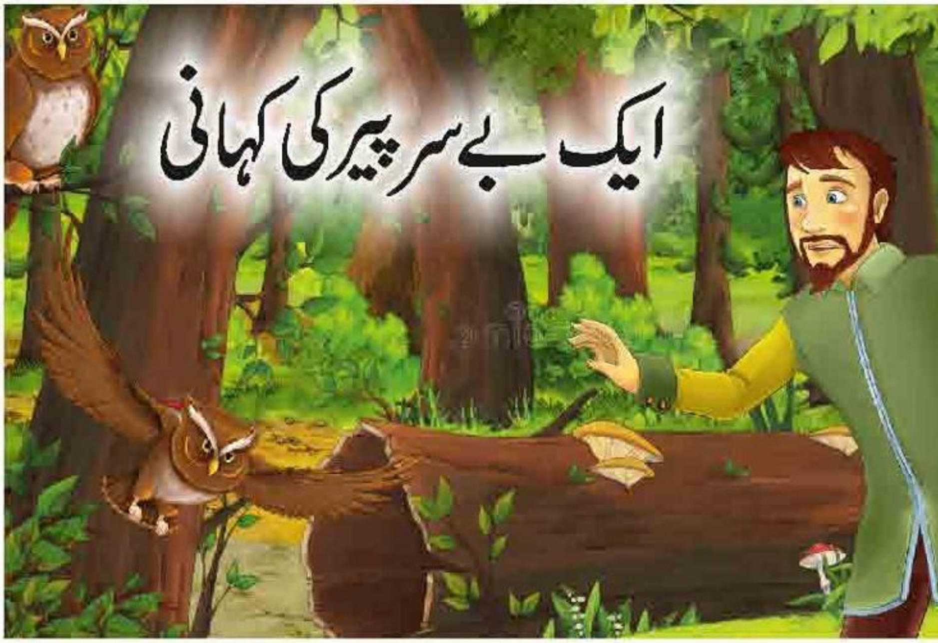

ذکیہ مشہدی

اب یہ کیا بات ہوئی بھلا۔ بے سر پیر کی کہانی۔ کہیں کہانی کے بھی سر پیر ہوتے ہیں؟ ہوتے تو ہیں جو اس کہانی کے پاس نہیں ہیں۔ ارے بھئی بے سر پیر کا مطلب ہوتا ہے ایسی کہانی جو بے تکی ہو۔ باتوں کے لیے بھی کہا جاتا ہے بے سر پیر کی باتیں۔ یعنی جو باتیں عجیب سی ہوں یا انمل بے جوڑ ہوں۔ تو بھئی اگر کہانی بے تکی ہے یا اس میں انمل بے جوڑ باتیں ہیں تو کہانی سنیں کیوں؟ یا یوں کہیے کوئی اسے سنائے ہی کیوں؟

بات یہ ہے کہ بے سر پیر کی کہانیاں اکثر بڑی مزیدار ہوتی ہیں۔ ان سے لوگوں کی تفریح ہوتی ہے۔ خاص طور پر بچوں کی۔ بچے ہنس لیتے ہیں؛ خوش ہو جاتے ہیں۔ اور ایسا بھی نہیں کہ یہ کہانیاں اور کسی کام کی نہیں ہوتیں۔ ارے نہیں بھائی۔ سبھی کہانیوں سے کوئی نہ کوئی نئی بات معلوم ہوتی ہے۔ نئے الفاظ سیکھنے کو ملتے ہیں۔ پڑھنے کا شوق پیدا ہوتا ہے۔

تو آؤ ایک بے سر پیر کی کہانی سنتے ہیں۔ یا یوں کہیں کہ پڑھتے ہیں۔ پرانے زمانے کی بات ہے۔ اس وقت جانوروں کے علاوہ اور کوئی سواری نہیں تھی۔ لوگ گھوڑے، گدھے، خچر وغیرہ پر بیٹھ کر سفر کرتے تھے۔ یا پھر انھیں جانوروں کو گاڑی میں جوت لیتے تھے۔ اس گاڑی سے سفر کرتے اور سامان بھی ادھر اُدھر پہنچاتے تھے۔ راستہ دُور کا نہ ہوا تو سب سے بڑی سواری تھی... پتہ ہے وہ کیا تھی؟ ٹھیک سمجھا تم نے۔ اپنے پیر۔ لوگ پیدل ہی چل پڑتے تھے۔

تو اسی پرانے زمانے کی بات ہے، ایک شخص کو پاس کے گاؤں جانا تھا۔ اس کا نام تھا بابو خاں۔ وہ ادھیڑ عمر تھا لیکن ہاتھ پاؤں کا مضبوط تھا۔ وہ وہاں پیدل ہی گیا۔ پھر کام ختم کر کے واپس چل پڑا۔ رستہ زیادہ لمبا نہیں تھا لیکن بیہڑ تھا۔ بیہڑ کا مطلب یہ کہ راستے میں جنگل، جھاڑیاں، پتھر، نالے وغیرہ بہت تھے۔ وہ تیز تیز چلا جا رہا تھا تبھی ایک طرف سے ایک اور شخص آتا دکھائی دیا۔ وہ ایک نوجوان لڑکا تھا۔ ایک سے بھلے دو۔ دونوں کو ہی یہ ساتھ اچھا لگا۔ کچھ دور چل کر لڑکے نے کہا، چچا یا تو آپ مجھے اُٹھا کر لے چلیں یا میں آپ کو اُٹھا کر لے چلتا ہوں۔

بابو خان نے لڑکے کی طرف دیکھ کر سوچا۔ اچھا بھلا

معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ایسی بے سر پیر کی بات کر رہا ہے۔ بھلا ایک آدمی دوسرے کو اُٹھا کر کیسے چلے گا۔ وہ چپ رہا۔

کیوں چچا۔ جواب نہیں دیا۔ لڑکے نے پھر پوچھا۔

بابوخان اس بار بھی چپ رہے۔

''اچھا تو ایسا ہے کہ ہم دونوں ایک ایک گھوڑا لے لیں۔ اس کے سہارے رستہ آسانی سے کٹ جائے گا۔''

اب کی بابوخان ناراض ہو گئے۔ کچھ غصے سے بولے۔ ''ارے میاں کچھ عقل لے کر پیدا ہوئے تھے یا نہیں۔ کہاں ہیں گھوڑے اور کہاں ہیں ان کے دام۔ پھر رستہ بھی تو چھوٹا ہی ہے۔''

وہ لڑکا چپ ہو گیا۔

آخر رستہ کٹ گیا۔ گاؤں دکھائی دینے لگا۔ شروع ہی میں ایک کسان اپنے کھیت میں کام کرتا ہوا ملا۔ لڑکے نے اس سے پوچھا ''کیوں بھائی جان کھیتی بوئی ہے یا کھائی ہے؟'' کسان ناراض ہو گیا۔ بولا دیکھ نہیں رہے۔ نرائی کر رہا ہوں۔ گیہوں کی فصل بالشت بھر ہوئی ہے۔ ابھی سے کیسے کھا لوں گا۔ عجب بے سر پیر کی بات کر رہے ہو تم میاں لڑکے۔''

پھر بابوخاں اور اس لڑکے کے راستے الگ ہونے لگے۔ وہ دائیں مُڑا اور بابوخاں بائیں۔ یکا یک بابوخاں کو خیال آیا کہ لڑکا ہے سیدھا سادا۔ جانے کہاں جا رہا ہے۔ کس کا کون ہے۔ انھوں نے اس سے نام اور ٹھکانا پوچھا۔ لڑکے نے اپنا نام روشن علی بتایا۔ بتایا کہ وہ یہاں کے مکھیا سے ملنے آیا ہے۔ چوپال میں ہی ٹھہر کر کل چلا جائے گا۔

بابوخاں گھر پہنچ گئے۔ ان کی بیوی مر چکی تھی۔ گھر پر ان کی بیٹی اور بابوخاں کی اماں رہتی تھیں۔ بابوخاں بھی کھیتی باڑی کرتے تھے۔

بیٹی نے باپ کے ہاتھ دھلوائے۔ ایک پیالہ گھر کی گائے کا دودھ پیش کیا۔ سفر کا حال احوال پوچھا۔

''سب ٹھیک تھا بیٹی۔ کام بھی ہو گیا۔ بس رستے میں ایک لڑکا ملا تھا۔ اس نے بڑا دماغ چاٹا۔ رستے بھر بے سر پیر کی باتیں کرتا رہا۔ ویسے دیکھنے سننے میں اچھا تھا۔''

کیا دماغ چاٹا ابا۔ لڑکی ہنس پڑی۔

بابوخاں نے اس کی ساری باتیں بتائیں۔ گود میں اٹھا کر لے چلنے والی۔ گھوڑا لے آنے والی۔ پھر کسان سے پوچھنا کہ کھیتی بوئی ہے یا کھائی ہے۔ ساری باتیں بے سر پیر کی بٹیا۔

لڑکی پھر ہنسی۔ ''نہیں ابا باتیں بے سر پیر کی نہیں تھیں۔ گود میں اُٹھا کر لے کر چلنے کا مطلب تھا یا تو کوئی کہانی سناؤ یا میں سناتا ہوں۔ کہانی سنتے سناتے چلنے سے رستہ آسانی سے کٹ جاتا ہے۔ جیسے کوئی تمھیں گود میں لے چل رہا ہو۔''

بابوخاں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ انھوں نے سر ہلایا۔ ''ہاں یہ تو ہے بٹیا۔ اب اور باتوں کا بھی کوئی مطلب ہوگا۔''

''ہاں ابا۔ گھوڑا لے آنے کا مطلب تھا درخت سے چھڑی توڑ لاؤ۔ چھڑی کے سہارے چلنے سے رستہ آسان ہوتا ہے۔ کنکر پتھر ہٹاتے چلو۔ کوئی سیار، کتا، لومڑی مل جائے تو اسے دھمکا کر بھگا دو۔ کہیں گھنے درخت ہوں تو ان کی شاخیں بھی ایک طرف کو کر لو۔''

بابوخاں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ارے واہ۔ اور وہ تیسری بات۔ ''جی ابا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کسان قرضے میں تو نہیں ڈوبا ہوا ہے۔ اگر کسان نے قرض لیا ہوا ہے تو کھیتی گویا کھا چکا ہے۔ جب فصل آئے گی تو قرضہ ادا کرنے میں ختم ہو جائے گی۔ اگر قرضہ نہیں لیا ہے یا بہت تھوڑا ہے تو فصل سے اسے اناج ملے گا۔ اناج بیچ کر پیسہ بھی ملے گا۔ اس طرح وہ سچ مچ کھیتی بو رہا ہے۔

بابو خاں نے کہا ”بیٹی تُو تو بڑی عقل مند ہے۔ اور وہ لڑکا بھی۔ وہ یہاں چوپال میں ٹھہرا ہے۔ اسے کچھ کھانا بھجوا دینا۔ میں بے چارے سے بلا وجہ ناراض ہوتا رہا۔“

لڑکی نے کہا ضرور ابا۔

دوپہر کو اس نے کھانا تیار کیا۔ کھیت پر کام کرنے والے نوکر کو بلایا۔ اس کے ہاتھ میں انگوچھے میں بندھا کھانا دے کر کہا۔ چوپال میں باہر سے ایک آدمی آیا ہے، اسے دے آ۔ اس سے یہ بھی کہہ دینا کہ چاند چودھویں کا ہے، ستارے بے شمار ہیں، اور دریا میں پانی چڑھا ہوا ہے۔ ملازم کھانا لے کر چلا گیا۔ لڑکے کو کھانا کھلا کر برتن واپس لایا اور بولا۔ انھوں نے کہا ہے چاند دسویں کا تھا۔ ستارے کم کم تھے اور دریا اُتار پر تھا۔

لڑکی نے ملازم کو بہت ڈانٹا کہ اس نے مہمان کا کھانا چُرا کر کھایا ہے۔ ملازم نے اپنا قصور مان کر معافی مانگی۔ وعدہ کیا اب وہ ایسا کچھ نہیں کرے گا۔ وہ ڈر گیا کہ لڑکی کے قبضے میں کوئی جن ہے۔ تبھی تو اسے فوراً معلوم ہو گیا کہ اس نے کھانا چرایا تھا۔

بابو خاں کو بھی تعجب ہوا۔ انھوں نے پوچھا ”بیٹی تمھیں کیسے معلوم ہوا؟“

لڑکی نے جواب دیا۔ ”مجھے اس شخص پر اکثر شک ہوتا تھا۔ اس لیے کھانا دینے سے پہلے پیغام دیا تھا۔ چاند چودھویں کا ہے۔ یعنی برتن میں چودہ روٹیاں ہیں۔ ستارے بے شمار ہیں یعنی گوشت کی بوٹیاں بہت سی ہیں۔ دریا چڑھاؤ پر ہے یعنی سالن میں شوربہ بھی بہت ہے۔

اس نے جواب دیا چاند دسویں کا ہے یعنی چار روٹیاں کم ہیں۔ ستارے کم کم ہیں یعنی بوٹیاں تھوڑی سی ہیں۔ دریا اُتار پر ہے۔ ابا اب تو آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ شوربہ بھی تھوڑا ہی ہے۔“

بابو خاں بہت ہنسے۔ بیٹی کی پیٹھ ٹھوکی اور بولے۔

”مگر بٹیا پھر بھی ہم کہیں گے کہ بات سیدھی سیدھی کرنی چاہیے۔ ورنہ جو نہیں سمجھے گا اسے بے سر پیر کی کہے گا۔“

(کہانی کا مرکزی خیال ایک لوک کتھا سے ماخوذ ہے)

(تعارف جنوری 2021 کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

■

Zakia Mashhadi
F-1, Grand Pallavi Court
Judges Court Road
Patna - 800004 (Bihar)

ٹماٹر کہاں سے لاؤں

محمد قمر سلیم

بچو! آپ لوگوں کی عادتیں بھی بڑی عجیب ہوتی ہیں، جیسے کسی بچے کو انڈا پسند ہوتا ہے تو کوئی بچہ چاکلیٹ کا شوقین ہوتا ہے۔کوئی بچہ کہانی سن کر کھانا کھاتا ہے تو کسی بچے کو ماں ٹہل ٹہل کر کھانا کھلاتی ہے۔ کسی کو کوئی پھل پسند ہوتا ہے تو کسی کو کوئی سبزی پسند ہوتی ہے، یہی نہیں بلکہ بچے اپنی پسند اور عادت کی وجہ سے ضدی بھی ہو جاتے ہیں۔

آپ کو بچوں کی ضد کے تعلق سے ایک واقعہ سناتا ہوں۔ بچو! تم نے اکبر بادشاہ اور بیربل کے قصے تو بہت سنے ہوں گے۔ میں بچپن سے سنتا آرہا تھا کہ ایک بار بیربل بادشاہ اکبر کے دربار میں بہت دیر سے پہنچے۔ اکبر کو بہت غصہ آیا۔ انھوں نے بیربل سے غصے سے کہا، ’اتنی دیر سے کیوں آئے ہو۔‘

بیربل نے کہا، ’بادشاہ سلامت میرے گھر پر ایک بچہ ہے۔ اس نے ایک خواہش ظاہر کی تھی اور وہ اس کے لیے بہت ضد کر رہا تھا۔‘

یہ سن کر بادشاہ اکبر بولے، ’یہ غلط بات ہے، بچے بہت بھولے ہوتے ہیں وہ ضد نہیں کرتے۔‘

بیربل نے کہا، ’حضور میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔‘

کچھ سوچتے ہوئے اکبر بادشاہ نے کہا، ’ٹھیک ہے کل اس بچے کو دربار میں لے کر آنا۔‘

دوسرے دن بیربل بچے کو دربار میں لے کر آئے۔ اکبر نے اس بچے کو اپنے پاس بٹھایا، بہت لاڈ پیار کیا اور پوچھا، ’بیٹا کیا کھاؤ گے۔‘

بچے نے جواب دیا۔ میں گنا کھاؤں گا۔ پھر کیا تھا بادشاہ نے گنے لانے کا حکم دیا۔ لاجواب گنے بچے کے سامنے پیش کیے گئے۔ اس نے ایک گنا پسند کیا۔ اکبر نے حکم دیا گنے کی گنڈیری کاٹ کر تشتری میں سجا کر لے کر آؤ۔ حکم کی تعمیل ہوئی۔ ایک تشتری میں گنڈیری خوبصورتی سے سجا کر بچے کے سامنے پیش کی گئی۔

جیسے ہی اس نے گنڈیری دیکھی وہ بولا ’میں یہ نہیں کھاؤں گا۔‘ بادشاہ نے اس کی خوب خوشامد کی لیکن اس نے گنڈیری کو چھوا تک نہیں۔

اس پر اکبر نے کہا، ’بچے کے لیے دوسرے گنے لے کر آؤ۔‘ پھر لاجواب گنے بچے کے سامنے پیش کیے گئے۔ اکبر نے اس سے بہت پیار سے کہا، ’بیٹا، اس میں سے اپنی پسند کا گنا لے لو۔‘

بچے نے گنا لینے سے منع کر دیا۔ اب بادشاہ اکبر

پریشان ہوگئے اور انھیں غصہ بھی آرہا تھا۔انھوں نے بچے سے کہا بیٹا گنا کیوں نہیں لے رہے ہو۔

بچہ بولا،'اس میں میرا اوالا گنا نہیں ہے۔'

اکبر بادشاہ نے کہا،'ارے بیٹا یہ سب آپ کے ہی ہیں۔'

بچہ روتے ہوئے بولا،'مجھے وہی گنا ثابت چاہیے جس کی آپ نے گنڈیری بنوائی ہے۔'

اب تو اکبر بادشاہ کا پارہ ساتویں آسمان پر تھا۔وہ بولے،'یہ کیسی ضد ہے۔گنڈیریوں کا گنا کیسے بنے گا۔'

بچہ روتے روتے کہتا جارہا تھا،'مجھے میرا اوالا گنا لاکر دو۔'

اب وہ بچہ اکبر کی برداشت سے باہر ہونے لگا۔اکبر نے غصے سے کہا،'بیربل اسے یہاں سے لے کر جاؤ۔بچے اتنے ضدی ہوتے ہیں مجھے نہیں معلوم تھا۔'

بیربل نے کہا،'حضور، میں نے تو آپ سے پہلے ہی کہا تھا، بچے بہت ضدی ہوتے ہیں۔'

جانتے ہو بچو! ایسا ہی ایک لڑکا تھا۔اس کا نام محسن تھا۔وہ بھولا تو بہت تھا لیکن اس کی ایک عادت بڑی عجیب تھی، ٹماٹر کھانے کی اور ٹماٹر بھی ثابت کھاتا تھا۔ٹماٹر کھانے کا شوق محسن کو اس وقت سے تھا جب اس نے بولنا بھی نہیں سیکھا تھا اور صرف اشاروں سے بات کرتا تھا۔ایک بات اور تھی کہ ٹماٹر کھانے میں نہ تو گنتی کی قید تھی اور نہ ہی وقت کی قید تھی۔ جس وقت محسن کا موڈ ہوا اس وقت اسے ٹماٹر چاہیے۔ٹماٹر بھی ایک نہیں بلکہ پلیٹ میں بہت سارے ٹماٹر۔اسی لیے اس کی امی ٹماٹر ہمیشہ رکھتی تھی کہ پتہ نہیں محسن کب ٹماٹر مانگ لے۔ غالباً اس وقت محسن کی عمر ایک ڈیڑھ سال ہوگی۔ایک دن کی بات ہے کہ محسن سو کر اٹھا تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔محسن نے دودھ پیا اور اسے ٹماٹر کی طلب ہوئی۔اس کی امی نے باورچی خانے میں جاکر دیکھا تو ٹماٹر نہیں تھے۔اس کی امی نے اسے بہت بہلانے کی کوشش کی لیکن محسن نے ضد پکڑلی تھی کہ ٹماٹر ہی چاہیے۔اب محسن نے اشارے کرنا شروع کردیے یعنی باہر سے لے کر آؤ۔محسن سے سب نے کہا بھیا دکانیں بند ہیں لیکن وہ اتنا چھوٹا تھا کہ سمجھ ہی نہیں پارہا تھا برابر ہاتھ سے باہر کی طرف اشارے کررہا تھا۔محسن کے بھائی نے اسے گود میں لیا اور دروازے سے ہی دکھادیا کہ سب بند ہے، لیکن محسن کو یقین ہی نہیں ہورہا تھا اور محسن بار بار اشاروں سے دوکان پر جانے کے لیے بضد تھا۔اب اس کے بھائی کے پاس اسے باہر لے جانے کے سوا دوسرا کوئی راستہ نہیں تھا۔محسن اشارے کرتا ایک گلی سے دوسری گلی، دوسری گلی سے تیسری گلی۔ساری دکانیں دکھادی گئیں کہ سب بند ہیں۔اس کے بھائی محسن کو تقریباً ایک گھنٹے تک ٹہلاتے رہے لیکن محسن کو تو ٹماٹر چاہیے تھے۔آخرکار بھائی نے جھنجلا کر کہا،'کہاں سے لاؤں ٹماٹر۔'

جب محسن کو اچھی طرح اندازہ ہوگیا کہ آج ٹماٹر نہیں ملنے والے ہیں تو بڑی مشکل سے محسن گھر آیا۔بے چارہ اپنا درد کیسے بیان کرتا کہ ٹماٹر نہ ملنے سے اسے کتنی تکلیف ہوئی ہے۔ وہ رو رو کر اپنے دل کا درد بیان کرنے کی کوشش کرتے کرتے کب سو گیا معلوم نہیں۔اس دن کے بعد سے محسن کی امی یاد سے ٹماٹر رکھتی تھی۔

لیکن بچو! محسن تو بہت چھوٹا تھا، ویسے ہمیں ایسی کوئی بھی عادت نہیں ڈالنا چاہیے جس کے پورا نہ ہونے کی وجہ سے تکلیف ہو۔

(تعارف جنوری 2021 کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

■

Mohd Qamar Saleem
A-47, Zakir Bagh
Okhla Road
New Delhi - 110025

کہانی

بابو آر کے

کانجی ہاؤس

بچو! آج ہم آپ کا تعارف کانجی ہاؤس سے کراتے ہیں۔ انسانوں اور فصلوں کو نقصان پہنچانے والے آوارہ جانوروں کو جس قید خانے میں قید رکھا جاتا ہے اُسے کانجی ہاؤس کہتے ہیں۔ جانوروں کے مالک جرمانے کی رقم اداکرنے کے بعد ہی اپنے جانوروں کو گھر لے جا سکتے ہیں۔ دیہاتوں میں کانجی ہاؤس کے انتظامات گرام پنچایت دیکھتی ہے اور شہروں میں نگر پریشداس کی ذمے دار ہوتی ہے... تو آئیے آوارہ جانوروں کے اس قید خانے یعنی کانجی ہاؤس کی ایک دلچسپ کہانی سنتے ہیں:

شہر کے کانجی ہاؤس میں پچھلے دو تین دنوں سے گدھا، گائے بھینس اور گھوڑا قید تھے۔ یہ سب جانور ایک دوسرے سے اچھی طرح گھل مل گئے تھے۔ ایک دن گدھے نے سب کو مخاطب کیا اور بولا۔ دوستو! میں اس گھر کا سب سے سینئر ممبر ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کے زیادہ دن یہاں گزارے ہیں۔ آپ لوگ میرے مقابلے میں ہوشیار ہیں عزت دار ہیں۔ میرا یہاں آنا تو سمجھ میں آ سکتا ہے۔ لیکن آپ لوگوں کی یہاں آمد میرے لیے حیرانی کا باعث ہے اس لیے آپ لوگ مجھ احمق، چغد کو بتائیں کہ آپ کا یہاں آنا کیسے ہوا؟ پھر گدھے نے گھوڑے کو مخاطب کیا، ”کہیے بھائی غازی! آپ کے یہاں آنے کی وجہ کیا تھی؟ کچھ نہیں۔“ گھوڑے نے کہا۔ ”بس خدا کی زمین پر میں نے ایک کسان کا ہرا بھرا کھیت چر لیا تھا...۔

بس اتنی سی خطا پر ہنگامہ ہوگیا۔ کسان کی وجہ سے سارا پولس عملہ حرکت میں آ گیا۔ میری خوب پٹائی ہوئی اور سزا کاٹنے یہاں لایا گیا۔ گھوڑے کی روداد سننے کے بعد میاں گدھے نے بھینس کی طرف توجہ دی..... اور محترمہ! آپ کی تشریف آوری کا مقصد خاص؟ سزا کاٹنا، اور کیا؟... بھینس نے روکھے لہجے میں کہا..... اور آپ کا جرم کیا تھا؟ گدھے کا اگلا سوال تھا۔ کچھ نہیں ..... میں نے غصے میں پڑوس کے چھوٹے بچے کو سینگوں سے اٹھا کر پھینک دیا تھا۔ بھینس نے کہا۔ ’ناراضگی کی وجہ؟‘ گدھے نے دریافت کیا۔ ایک نہیں کئی وجہیں ہیں۔ بھینس نے کہا۔ کیا ہم بھینسیں انسانوں کو دودھ اور کھاد دینے کے لیے ہی پیدا ہوئے ہیں؟ کیا ہم بھینسوں کے کوئی ارمان نہیں؟ کیا ہمارے جذبات نہیں؟ کیا ہم میں مامتا نہیں؟ یہ ظلم نہیں تو کیا ہے؟ کہ ہم اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو اپنا دودھ بھی نہیں پلا سکتیں۔ کیا ہمارے دودھ پر ہمارے بچوں کا کوئی حق نہیں.....؟ ہمارے چھوٹے چھوٹے بچوں کے دودھ پی لینے کے خوف سے، یہ انسان انھیں قصائی کے حوالے کرتا ہے، ہم اپنا خون پانی ایک کر کے انسان کے لیے دودھ دیتے ہیں اور یہ بے ایمان ہمارے دودھ میں پانی ملاتا ہے اور تہمت ہم پر رکھتا ہے کہ..... کیا کریں بھینس دودھ ہی ایسا دے رہی ہے..... بس یہ سوچ کر زندگی سے تنگ آ کر میں نے غصے میں اپنا کھونٹا توڑا اور گھر سے نکل کر پڑوس کے بچے کو پٹخ دیا..... نتیجے میں مجھے یہاں لایا گیا۔“ بھینس کے خیالات جاننے کے بعد میاں گدھے نے گائے کی طرف رخ کیا اور بولا..... آپ تو ساری دنیا میں ایک غریب جانور اور شریف مخلوق کے طور پہ مشہور ہیں۔ آپ کی شرافت اور نیک نامی کے ڈنکے دن رات بجتے ہیں۔ پھر بھلا ایسی نامعقول جگہ پر آپ جیسی معقول ہستی کا آنا۔ سمجھ میں نہیں آتا..... ہماری شرافت ہی ہم گایوں کو لے ڈوبی۔ گائے نے کہا۔ غریب کہہ کہہ کر دنیا ہم پر ظلم کرتی آئی ہے۔ یہ انسان ہمیں دودھ کی مشین سمجھتے ہیں اور ہمارے تھنوں کو دودھ کے نل۔ جب چاہتے ہیں ہمارا دودھ دوہنے بیٹھ جاتے ہیں۔ ہمارا بھی کوئی موڈ ہے۔ مزاج ہے، دکھ ہے، سکھ ہے۔ ایک دن مجھے بھی غصہ آ ہی گیا اور میں نے بھی خلاف توقع اپنے مالک کو سینگ مار کر زخمی کر دیا... سینگ مارتے ہی سارے گھر میں جیسے قیامت آ گئی۔ سارے کے سارے ڈنڈے لیے مجھ پر چڑھ دوڑے۔ گھر کی ایک بوڑھی خاتون بولیں گائے ہو کر مارتی ہے۔ بے شرم بے حیا ڈوب مر کلموہی ..... کیوں اپنی ماں، دادی اور نانی کے نام کو بٹہ لگاتی ہے۔ چل نکل کہہ کر سب نے مجھے گھر سے نکال دیا۔ میں بے آبرو ہو کر گھر سے نکلی اور غصے میں بازار چلی آئی۔ بازار میں جا بجا عید کی چہل پہل تھی۔ میووں کے تھال سجے تھے۔ میوے دیکھتے ہی میرے منہ میں پانی بھر آیا۔ میں سوچنے لگی..... اے کاش! میں بھی دنو باجی کے آشرم پونار میں ہوتی..... تو اور گائیوں کے ساتھ میں بھی میوے کھا رہی ہوتی..... خیر وہ گائیں ہو کر میوے کھا سکتی ہیں تو کیا ہوا؟ میں بھی کھا سکتی ہوں، بس یہی سوچ کر میں نے ایک دکان کے سامنے رکھے ہوئے تھال پر منہ مارا اور..... پھر میری خوب پٹائی ہوئی اور میں یہاں لائی گئی۔

اس طرح جب گھوڑا، بھینس اور گائے اپنی اپنی روداد سنا چکے..... تب ان تینوں نے میاں گدھے سے دریافت کیا کہ ان کے یہاں جلوہ افروز ہونے کے کیا اسباب ہیں؟ جواب میں میاں گدھے نے کہا۔ اپنا کیا ہے ساتھیو! ہم تو ٹھہرے بیوقوف، جاہل اور گنوار، مالک نے جب چاہا کام لیا۔ جب چاہا ڈنڈے مار کر نکال دیا۔ اس دنیا میں اپنا کوئی ہمدرد نہ غمگسار۔ ہم گدھوں کے ساتھ تو یہ اکثر ہوتا آیا ہے دوستو! کہ جب کبھی ہمارے مالک کے پاس ہمیں کھلانے کے لیے نہیں

ہوتا تب وہ ہمیں گھر سے نکال دیتا ہے اور پھر ہم خرمستیاں کر کے یہاں آجایا کرتے ہیں۔ خدا کے فضل سے ہم یہاں بھو کے نہیں رہتے..... اور جانوروں کے ساتھ ہمیں بھی کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے اس لیے ہم اپنے مالک کے گھر کم اور یہاں زیادہ رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کہیں کہیں کانجی ہاؤس کو گدھے گھاٹ بھی کہا جاتا ہے۔

دوستو! میں بھلے ہی ناقص العقل سہی..... لیکن میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس مرتبہ میں خرمستیوں سے نہیں بلکہ بشرمستیوں سے یہاں آیا ہوں۔ میاں گدھے کی کہانی سارے جانور بغور سننے لگے۔ ہوا یہ دوستو! کہ میں حسب معمول ایک گلی میں کاغذ کھا رہا تھا..... اس دوران کچھ شرارتی بچوں نے پٹاخوں کی لڑی میری دم سے باندھ دی۔ اس شرارت کی مجھے خبر نہ ہوئی۔ پھر بچوں نے پٹاخوں کو ماچس کی تیلی دکھائی..... بس پھر کیا تھا، پٹا پٹ اور دنادن کا ایک شور ہوا۔ مجھ پر قیامت ٹوٹی۔ میں سمجھا کہ اب قیامت دم کے راستے سے آگئی ہے اس لیے میں دم دبا کر بھاگا۔ دم دباتے ہی مجھے آگ کے جھٹکے لگے..... پھر تو میں دیوانہ وار بھاگا۔ بھاگتے بھاگتے ایک شادی کے منڈپ میں جا گھسا۔ باراتیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ دولھے میاں چاروں خانے چت اور قاضی بھی لوٹ پوٹ ہوئے۔ منڈپ میں سب کچھ تہس نہس ہوگیا اور پھر..... منڈپ سے بجائے دولھے کے، میری بارات نکلی ..... اور جلوس کے ساتھ میں یہاں چلا آیا۔

گدھے کی روداد سننے کے بعد سارے جانور خاموش بیٹھے رہے اور سوچتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد گھوڑے نے کہا: ساتھیو! ہم سب کے حالات سننے کے بعد مجھے لگتا ہے کہ ان تمام واقعات کا ذمے دار خود انسان ہے۔ ہم نہیں۔ میرا ہی معاملہ لے لیجے، اگر میرا مالک مجھے پیٹ بھر گھاس کھلا دیتا تو مجھے کیا پڑی تھی جو میں کسان کا کھیت چرتا۔ اس طرح ان کا مالک بھینس کی طرف اشارہ کر کے ان کے چھوٹے بچوں کو کچھ دن دودھ پینے دیتا، بچوں کو قصائی کے حوالے نہ کرتا۔ دودھ میں پانی نہ ملاتا تو..... انھیں غصہ نہ آتا اور یہ پڑوس کے بچے کو نہ پٹختی ..... یہی حال ہماری گائے محترمہ کا ہے۔ ان کا مالک انھیں دودھ کی مشین نہ سمجھتا تو کیوں یہ اپنے مالک کو سینگ مارتی اور اپنی شرافت کو بٹہ لگاتی...؟ اب رہا معاملہ میاں گدھے کا..... میں مانتا ہوں کہ میاں گدھے واقعی بیوقوف ہیں لیکن انھیں حماقتوں پر مجبور تو انسان ہی کرتے ہیں اور مزے بھی وہی لیتے ہیں۔ ہم سے غلطیاں، انسان کرواتا ہے اور سزا ہمیں ملتی ہے یعنی کرے اور کوئی بھرے اور کوئی۔ یہ کہتے ہوئے گھوڑے کی آنکھوں سے آنسو جھلک پڑے..... میاں گدھے کا دل بھی بھر... اور گائے بھینس بھی ملول ہوئیں .... پھر سب کو مخاطب کر کے گائے بولی..... ارے ہم جانور ہوئے تو کیا ہوا؟ ہماری آہیں بھی رنگ لا رہی ہیں۔ جب تک انسانوں کا سلوک ہمارے ساتھ بہتر نہ ہوگا تب تک نت نئی مصیبتوں میں یہ انسان مبتلا رہے گا اسی طرح سوکھے آئیں گے، سیلاب اور زلزلے آئیں گے، کورونا آئے گا، تباہی مچے گی، مہنگائی بڑھے گی لیکن یہ سب سوچ سوچ کر میرا کلیجہ منہ کو آتا ہے اور میں اللہ سے دعا کرتی ہوں کہ وہ انسانوں کو ان مصیبتوں سے محفوظ رکھے اور ہم جانوروں سے پیار کرنے کی انھیں توفیق بخشے۔ یہ سن کر گدھے، گھوڑے اور بھینس نے آمین کہا اور اپنی اپنی جگہ جا کر بیٹھ گئے۔

(تعارف اپریل 2022 کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے۔)

■

Babu R.K
Quasidpura, Achalpur City- 444806
Distt.: Amravati (Maharashtra)
Mob.: 9890985449

کہانی

پودوں کی فریاد

سلیم خان

گرمی کا موسم تھا۔ تیز دھوپ، سبزہ زاروں کی شادابی اور ندی نالوں کا پانی پی گئی تھی۔ گرم ہواؤں سے سارا جنگل سائیں سائیں کررہا تھا۔ تالاب کے آس پاس املی، پیپل، نیم اور برگد جیسے تناور درخت تھے۔ جن کی آغوش میں پرندے اور چوپائے اپنی جان چھپائے بیٹھے تھے، لیکن وہیں قریب صندل، ساگوان، دیودار، ببول وغیرہ کے پودے بھی تھے جو کھلے میدان میں سخت گرمی سے جوجھ رہے تھے۔ چلچلاتی دھوپ سے گھبرا کر ساگوان کے پودے نے اپنے بیباک ساتھی صندل سے کہا، ''بھائی زمین سے پانی مل رہا ہے اور نہ غذا۔ اوپر سے گرمی روز بروز بڑھتی جارہی ہے۔ یہی حال رہا تو چند روز میں ہم سب مرجھا کر سوکھ جائیں گے۔

''ہاں بھائی ساگوان ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔'' دیودار نے اس کی تائید کی۔ ببول کے پودے نے تیوریاں چڑھا کر کہا، ''صندل بھائی، یہ سب ان لمبے گھنے پیڑوں کی بدمعاشی ہے۔ یہ ہمارے اطراف کا سارا پانی اور غذا جذب کرلیتے ہیں۔ دیکھو وہ مسٹنڈے کیسے ہرے بھرے لگ رہے ہیں۔ صندل اپنے ساتھیوں کی باتیں سن کر سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اس نے فکر انگیز لہجے میں کہا، ''ہاں بھائیو، آپ لوگ ٹھیک کہہ رہے ہیں، مجھے بھی اب بڑی تکلیف ہورہی ہے۔ میں ابھی ان پیڑوں سے بات کرتا ہوں۔

اور پھر صندل کا پودا تناور درختوں سے مخاطب ہوا، ''اے چھتنار پیڑو! ہم ننھے پودوں کا کچھ تو خیال رکھو، ہم مرجھا کر سوکھ رہے ہیں اور آپ لوگ کھا پی کر موٹے تازے ہورہے ہیں۔'' املی کا پیڑ جو پودوں سے بہت قریب تھا، اس نے جھک کر حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا، ''کیا بات ہے صندل بابا، کیوں لال پیلے ہورہے ہو۔ ہم نے کیا ظلم کیا ہے آپ لوگوں پر۔!'' صندل نے ناگواری سے جواب دیا، ''آپ لوگوں کی لمبی گہری جڑیں ساری غذا اور پانی جذب کرلیتی ہیں۔ اوپر

سے یہ آتشی نیزوں کی چُبھن۔ ہمارا تو جینا مشکل ہوگیا ہے۔"

ارے نادان پودے، ہم تو اپنی ضرورت کے مطابق غذا حاصل کرتے ہیں، اور ہماری جڑیں زمین کی گہرائی میں ہیں۔ جہاں تمھارا کوئی تعلق نہیں۔ رہی بات آتشی نیزوں کی تو آپ لوگ سورج سے فریاد کریں۔ شاید اسے تم پر رحم آجائے۔" املی کے پیڑ کی بات سن کر ساگوان نے کہا، "ہاں بھائی صندل، ہمیں سورج سے اپیل کرنی چاہیے۔ میں نے سنا ہے۔ ماحول کی تبدیلی میں اس کا بڑا عمل دخل ہے۔ صندل کے پودے نے پسینہ پونچھ کر اپنی سانسیں درست کیں اور پھر آگ اگلتے سورج سے مخاطب ہوا۔ "اے سنہرے سلطان، آپ سے ایک گزارش ہے۔"

"کون ہے بھائی، کہاں سے بول رہے ہو۔!" سورج نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"جی، میں صندل کا پودا بول رہا ہوں اجنتا کی پہاڑی سے۔" اچھا، اچھا، بولو کیا کہنا چاہتے ہو۔" جہاں پناہ، ہم معصوم پودوں سے تیز دھوپ برداشت نہیں ہورہی ہے۔ اپنی کرنوں کی آب تاب ذرا کم کیجیے۔ بڑی مہربانی ہوگی۔" سورج نے مسکرا کر جواب دیا، "ارے میرے پیارے" تم سمجھ رہے ہو میں تمھیں تکلیف پہنچا رہا ہوں، جان بوجھ کر دہک رہا ہوں۔ میں جانتا ہوں میری تیز کرنوں سے چرند، پرند اور تم جیسے کم سن پودوں کو بہت تکلیف پہنچتی ہے، لیکن کیا کروں، میں مجبور ہوں۔"

"مجبور ہیں۔! آپ کی کیا مجبوری ہے۔؟"

"ارے میاں، میری تپش میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی۔ میں اپنی جگہ قائم ہوں۔ زمین کی گردش کے سبب میں کبھی تم سے نزدیک اور کبھی دور ہوجاتا ہوں۔"

"میں سمجھا نہیں، آپ نزدیک اور دور کیسے ہوجاتے ہیں۔!؟

صندل نے حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ سورج نے اسے نرم لہجے میں سمجھایا، "صندل راجا، زمین کی شکل گول ہے، گیند کی طرح۔ وہ اپنے محور پر گھومنے کے ساتھ ساتھ میرے گرد بھی سال میں ایک چکر پورا کرتی ہے۔ زمین کی محوری گردش مطلب وہ لٹو کی طرح اپنی جگہ پر مسلسل گھومتی ہے۔ محوری گردش کا ایک چکر چوبیس گھنٹوں میں مکمل ہوتا ہے۔ جس سے دن رات وجود میں آتے ہیں۔ زمین کا جو حصہ میرے سامنے ہوتا ہے وہاں دن ہوتا ہے اور جو حصہ میری مخالف سمت میں ہوتا ہے۔ وہاں رات ہوتی ہے۔ اور میرے گرد زمین جو ایک سال میں ایک چکر لگاتی ہے۔ اسے مداری گردش کہتے ہیں۔ اس گردش کا راستہ جسے مدار کہتے ہیں وہ بیضوی (انڈے کی طرح) ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا درمیانی فاصلہ بدلتا رہتا ہے۔ جب زمین میرے قریب سے گزرتی ہے تو جو حصہ میرے سامنے ہوتا ہے۔ اس خطۂ ارض پر گرمی کا موسم ہوتا ہے اور جب زمین دور سے گزرتی ہے۔ تب میرے سامنے والے خطے پر سردی کا موسم ہوتا ہے۔ زمین کے محوری جھکاؤ اور مداری گردش کی وجہ سے زمین پر ہر جگہ موسم بدلتے ہیں۔ یہ سب قدرتی نظام ہے اور اس میں ہم سب کی بھلائی ہے۔

یہ سب باتیں قریب کا بوڑھا سوکھا پیڑ سن رہا تھا۔ اس نے دنیا کے سرد گرم اور کئی آندھی طوفان دیکھے تھے۔ اس نے ننھے پودوں سے کہا، "پیارے بچو! تمھیں ان درختوں اور سورج سے فریاد کرنے کی ضرورت نہیں۔ سورج ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ کائنات اس خالق و مالک یعنی اللہ کی تابع ہے۔ ہر شے اسی کے ماتحت چلتی ہے۔ ہماری ہر مصیبت اور پریشانی اللہ ہی دور کرسکتا ہے۔ وہی دن کو رات، اور رات کو دن میں بدلتا ہے۔ دن کو سورج سے روشن کرتا ہے اور رات کو چاند تارو ں سے جگمگاتا ہے۔ دیکھو ان چرند پرند کو کیسے آنکھیں بند کیے

سر جھکائے بیٹھے ہیں اور وہ دیکھو، اس آم کے پیڑ پر کوئل کیسے کوک رہی ہے۔ جب گرمی بڑھ جاتی ہے۔ وہ اپنی سریلی آواز میں کوکنا شروع کر دیتی ہے۔ یہ سب اپنے اپنے انداز میں دعا مانگ رہے ہیں۔

صندل نے سوکھے پیڑ کو حیرت سے دیکھتے ہوئے پوچھا، ''دادا جان، آپ تو کافی لمبے اور مضبوط ہیں، پھر آپ کی یہ حالت کیسے ہوگئی۔؟'' سوکھے پیڑ نے پودوں کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا، ''پیارے بچو۔! میں آس پاس کے ان تمام پیڑوں سے عمر رسیدہ ہوں، یہ سب میرے سامنے تمھاری طرح بچے تھے۔ اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ میری جڑیں کمزور ہو چکی ہیں۔ ان میں غذا حاصل کرنے کی طاقت نہیں رہی۔ تم یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ دنیا کی ہر شے فانی ہے۔ میرا سوکھا وجود اس حقیقت کی زندہ نشانی ہے۔ تم لوگ یہ بات یاد رکھو کہ اپنی پریشانی اور مصیبت دور کرنے کے لیے ہمیشہ اپنے خالق و مالک سے دعا کرنی چاہیے۔ وہی مشکل کشا حاجت روا ہے۔ بوڑھے پیڑ کی باتیں پودوں کے دل میں اتر گئیں۔

سب پودوں نے اپنی نرم نازک ڈالیاں جھکا کر دل سے دعائیں کیں، ''اے اللہ ہم کمسن کمزور پودے ہیں، تیز دھوپ اور گرم ہواؤں سے ہمیں بہت تکلیف ہو رہی ہے۔ سورج کی تپش کم کر دے مالک۔ ان گرم ہواؤں کو روک دے یا رب۔ ہم بہت دنوں سے پیاسے ہیں، ہماری جڑیں اور پتے سوکھ رہے ہیں۔ تو رحیم و کریم ہے مولا، رحم و کرم کی بارش کر دے۔''

معصوم پودوں کی دعائیں سن کر اللہ کی رحمت جوش میں آگئی اور دیکھتے ہی دیکھتے آسمان پر کچھ کالے بادل امڈ آئے۔ ان میں سے ایک بڑے سرمئی بادل نے آگ اگلتے سورج کا چہرہ ڈھک دیا اور آناً فاناً پہاڑی پر گہرا سایہ پھیل گیا۔ بدلی چھاتے ہی ہلکی ہلکی ہوائیں چلنے لگیں۔ پودوں کی گھبراہٹ کم ہوگئی اور وہ لمبی لمبی سانسیں لینے لگے۔ چوپائے تیز قدموں سے اُچھل کود کرتے ہوئے میدان کی طرف نکل آئے اور پرندے چہچہاتے ہوئے کھلے آسمان میں اپنی اڑان کے کرتب دکھانے لگے۔

پھر رات کو گہرے کالے بادل گِھر آئے اور موسلا دھار برستے رہے۔ دو روز تک مسلسل بارش ہوتی رہی۔ ندی نالے تالاب بھر گئے تھے اور ہر طرف سبزہ اُگ آیا تھا۔ تین چار دن بعد جب سورج نے پہاڑی پر اپنی سنہری کرنوں کی چادر پھیلائی تو زندگی جگمگا اٹھی۔ ہر طرف جانوروں کی چہل پہل، پرندوں کی دلکش آوازیں۔ مینڈکوں کی ٹرٹر، جنگل میں منگل ہوگیا تھا۔

پودوں کی رگ رگ سیراب ہوگئی تھی، ٹھنڈی ہوائیں، نرم نرم دھوپ، جل تھل زمین ان کے دلوں میں جینے کی امنگیں جگا رہی تھیں اور وہ جھوم جھوم کر سہانے موسم کا لطف اٹھا رہے تھے۔ اچانک جب صندل کے پودے کی نظر بوڑھے سوکھے پیڑ پر گئی تو اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے لہلہا کر کہا، ''بابا، بابا، آپ کے سوکھے تنے پر تو کونپلیں نکل آئی ہیں۔!'' سوکھے پیڑ نے مسکرا کر آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''بیٹا، یہ سب اللہ کی قدرت ہے۔ میں نے کہا تھا نہ وہ خالق و مالک بڑا مہربان ہے۔ اسی نے میرے سوکھے وجود کو یہ تازگی بخشی ہے۔'' صندل گہری نظر سے آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ ہر طرف گہرے کالے بادل چھائے ہوئے تھے اور آگ اُگلتے سورج کا کہیں پتا نہ تھا۔

(تعارف مارچ 2021 کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

■

Saleem Khan Ismail Khan
Millat Nagar Faizpur-425503
Distt.: Jalgaon (Maharashtra)
Mob.: 9730573897

امداد باہمی

سلطان ازاد

کم و بیش پچاس سال قبل کا قصہ ہے۔ جب میں نے ساتویں جماعت کے مڈل بورڈ کا امتحان مکمل کیا تھا۔اس کے نتیجہ کے بعد ہماری طرح دوسرے مڈل اسکولوں کے طلبا بھی محمڈن اینگلو عربک ہائی اسکول میں داخل ہوئے تھے۔ان دنوں آٹھویں جماعت میں تین شعبے تھے۔ سائنس (بایولوجی)، سائنس ایڈوانس اور آرٹس۔جن طلبا کے اچھے اور سائنس میں بہت اچھے مارکس تھے ان تمام لڑکوں کا سائنس (بایولوجی) اور سائنس (ایڈوانس) میں داخلہ ہوا اور بقیہ کم مارکس والے طلبا یا اپنی پسند سے شعبہ منتخب کرنے والوں کو آرٹس میں داخلہ ملا۔ داخلہ کی مدت تاریخ کے بعد تمام شعبوں کے طلبا کو کلاس ٹیچر نے فہرست نصاب نوٹ کرادی اور حکم دیا گیا کہ ہفتہ کے اندر اندر سبھی لڑکے کتاب اور کاپی وغیرہ خرید لیں کیونکہ اب جلد ہی کلاس شروع ہوگی اور سبھی گھنٹیوں کے مامور معلم کلاس لیں گے اور یہ کلاس متواتر ساتوں گھنٹی چلے گی۔ کتابوں کی عدم موجودگی میں ایسے طلبا کلاس نہیں کر پائیں گے۔انھیں کلاس میں یا تو میز پر کھڑا کر دیا جائے گا یا پھر کلاس سے باہر رکھا جائے گا۔

طے شدہ تاریخ سے کلاس شروع ہوئی۔ کلاس کے دوسرے دن کی چوتھی گھنٹی میں مطالعہ سماج کے لیے حیدر صاحب کلاس میں آئے اور سبھوں سے کتاب سامنے کھول کر رکھنے کو کہا اور پھر پہلا باب پڑھانے لگے۔اسی درمیان ایک لڑکے احمد فاطمی کی ڈیسک پر کتاب کی عدم موجودگی کے باعث پوچھ بیٹھے: تمھارے سامنے ڈیسک پر کتاب کیوں نہیں ہے؟ وہ چپ رہا تو حیدر سر غصہ ہوگئے اور اس کے پاس پہنچ کر اس کا کان مروڑتے ہوئے تھپڑ رسید کر دیا اور کہا کہ ایک تو کتاب سامنے نہیں رکھا اور پھر کوئی جواب بھی نہیں دیتا۔ تھپڑ کھا کر احمد فاطمی بلبلا کر رونے لگا اور کہنے لگا سر! میرے پاس کوئی کتاب نہیں ہے۔ یہ سن کر حیدر سر اور غصہ ہوئے اور چیختے ہوئے بولے، کتابیں نہیں ہیں تو پھر کلاس میں کیوں آئے۔ گھر پر کیوں نہیں رہے۔ اسکول آنے کی کیا ضرورت ہے؟ سر! میں نے بھائی جان سے کتابیں خریدنے کے لیے انھیں نصاب کی

فہرست دی تھی لیکن وہ کتابیں خرید کر اب تک نہیں لائے اور تمھارے والد صاحب؟ ہمارے والدین اس دنیا میں نہیں رہے۔ میرے بچپن میں ہی دونوں یکے بعد دیگرے انتقال کر گئے۔ صرف ایک بڑے بھائی ہیں جو پرائیویٹ نوکری کرتے ہیں۔ یہ باتیں سن کر حیدر صاحب کا غصہ ایک دم کافور ہوگیا اور وہ بھی آبدیدہ ہوگئے۔ انھیں اپنی سختی پر افسوس ہوا۔ انھوں نے اسے فوراً اپنے پاس کرسی کے قریب کھڑا کیا اور اس وقت کلاس میں ایک دم برقرار خاموشی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کلاس کے مونیٹر سبھی لڑکوں سے رقم وصول کریں۔ ایک دو دن میں سبھی کلاس کے لڑکے امدادی رقم جمع کردیں اور مونیٹر تم مجھ سے بھی یہ پانچ روپے لے لو اور نصاب کی ساری کتابیں جلد از جلد خرید کر احمد فاطمی کے حوالے کردو تا کہ وہ تمام کلاس فیلو (ہم جماعت) کے ساتھ بحسن وخوبی پڑھائی کر سکے۔

اس طرح مونیٹر نے دو دن میں کلاس کے تمام لڑکوں سے امدادی رقم وصول کی اور احمد فاطمی کے لیے نصاب کی تمام کتابیں، کاپیاں، انسٹرومین باکس، پنسل، قلم اور نیا بیگ خرید کر اس کے حوالے کردیا۔ دوسرے دن حیدر سر کلاس میں داخل ہوئے تو معلوم ہوا کہ احمد فاطمی کے پاس ساری کتابیں موجود ہیں اور وہ تمام گھنٹی میں کلاس کر رہا ہے تو انھیں بڑی خوشی ہوئی اور بولے کہ یہ باتیں تم دوستوں میں اس لیے کہیں کہ تم سبھوں میں پکی دوستی کے ساتھ امداد باہمی کا جذبہ پیدا ہو۔ یہ جذبہ خدمت خلق بھی ہے۔ اپنے آس پاس کے غریب دوستوں اور لوگوں کے ساتھ خوشی بانٹنے کا یہ ایک بہترین ذریعہ بھی ہے۔

وقت گزرا۔۔۔ سبھی میٹریکولیشن کر کے اِدھر اُدھر نکل گئے۔ کوئی کالج گیا، کوئی کام کاج میں لگ گیا اور کوئی تجارت میں مشغول ہوگیا۔ کئی سال بعد احمد فاطمی مجھے ایک ہائی اسکول کے پاس ملا۔ خیریت معلوم کی تو اس نے بتایا کہ وہ اسی ہائی اسکول کا مدرس ہے۔ اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ باتیں کرتا وہ کہنے لگا: میں امداد باہمی کو آج بھی یاد کرتا ہوں جس کے باعث میری بنیادی تعلیم مکمل کرنے میں تم سارے دوست آٹھویں جماعت سے لے کر دسویں تک اسی جذبے کے تحت میری مدد کرتے رہے۔ میں نے بھی اس 'امداد باہمی' کے سلسلے کو اپنے اسکول میں قائم کر رکھا ہے۔ میں نے کہا مبارک ہو! مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنا ماضی یاد رکھا اور حال میں اسے برت رہے ہو، خدا تمھیں اسی طرح کامیاب رکھے، آمین!

(تعارف جون 2022 کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

■

Sultan Azad
Pannu Lane, Gulzarbagh
Patna- 800007 (Bihar)

محمد عادل

گیان کا پٹارا

کہانی

رات کے نو بجے تھے، راجو نیوز چینل پر خبریں دیکھ رہا تھا۔ سبھی ٹی وی چینلس پر ایک ہی بریکنگ نیوز گردش کر رہی تھی۔

''ناسا نے خلائی دوربین جیمز ویب کی مدد سے اربوں سال پرانے ماضی میں جھانکا، 13 ارب سال پرانی کہکشاؤں اور ستاروں کی پہلی رنگین تصویر جاری کی۔''

راجو کو سائنس کے سبجیکٹ میں بڑی دلچسپی تھی۔ وہ اکثر اخبارات سے سائنسی معلومات کو کاٹ کر اپنی ڈائری میں چپکاتا تھا۔ جس کو اس نے 'گیان کا پٹارا' نام دیا تھا۔ گیان کا یہ پٹارا حیرت انگیز معلومات سے بھرا پڑا تھا۔ اس کے علاوہ راجو کو باغبانی کا بھی شوق تھا۔ گھر کے صحن میں اس نے ایک چھوٹی سی کیاری بنائی تھی۔ جس میں طرح طرح کے پھول لگے تھے۔ پھولوں کی خوشبو سے پورا گھر معطر رہتا تھا۔ گھر کے صحن میں ایک نیم کا پیڑ بھی تھا۔ رات کو راجو چارپائی ڈال کر صحن میں بیٹھ جاتا تھا۔ کھمبے پر لگی سولر لائٹ رات میں پورے گھر میں روشنی کر دیتی، وہ اس کی روشنی میں دیر رات تک پڑھتا رہتا۔

آج رات یہ خبر دیکھنے کے بعد وہ بہت متاثر ہوا تھا۔ اس کے ذہن میں بہت سے سوالات جنم لے رہے تھے۔ حیرت و تجسس کا یہ عالم تھا کہ راجو رات بھر پلنگ پر کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کی نگاہیں آسماں پر چمک رہے ستاروں پر جمی رہیں۔ جیسے یہ ستارے اس سے کچھ کہنا چاہ رہے ہیں۔ اسی کشمکش میں رات گزری اور صبح نمودار ہوئی۔

صبح کے ساڑھے چھ بج رہے تھے۔ راجو کو بے صبری سے آج کے تازہ اخبار کا انتظار تھا۔ وہ پلنگ سے اٹھا اور سیدھا دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔

پیچھے سے آواز آئی...

''ارے بیٹا کہاں جا رہا ہے؟ منہ ہاتھ تو دھو لے...''

ماں نے راجو کو ٹوکا۔

پر وہ تو اپنی دھن میں مگن تھا۔ وہ گھر کے مین گیٹ پر آ کر کھڑا ہو گیا۔

گلی سے فوجی چاچا اپنے ہاتھ میں چھڑی کو گھماتے ہوئے گزرے۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا۔ وہ ہر روز صبح سویرے جوگنگ کے لیے جاتے تھے اور راجو کے گھر کے آگے سے گزرتے تھے۔ راجو کے گھر سے آگے موڑ پر فوجی چاچا کا مکان تھا۔ جب اس گلی میں اخبار دینے کے لیے خبری لال اخبار والا آتا تو سب سے پہلے فوجی چاچا ہی کو اخبار دیتا۔ جیسے ہی فوجی چاچا گزرے راجو نے چاچا کو نمسکار کیا اور بڑے ادب سے کہا۔

''فوجی چاچا! آج کا اخبار آیا کیا؟''

''نہیں آج پتا نہیں خبری لال کہاں رہ گیا...'' چاچا نے کہا۔

''بہت دیر ہو گئی کہاں رہ گئے خبری لال؟''

راجو دل ہی دل میں بڑبڑایا۔

راجو بہت دیر دروازے پر کھڑا انتظار کرتا رہا۔ اور سوچتا رہا کہ آخر خبری لال کو کیا ہوا؟۔

لیکن جب گھنٹہ بجا ٹن ٹن۔ تب وہ اپنے خیالات کی دنیا سے باہر آیا۔

اندر سے ماں کی آواز آئی۔ ''کیا آج اسکول نہیں جانا ہے؟ دیر ہو جائے گی...''

''آ رہا ہوں ماں...'' راجو نے کہا۔

کچھ دیر بعد راجو یونیفارم پہنے، کندھے پر بستہ ٹانگے اسکول جانے کے لیے تیار تھا۔

''اچھا ماں! میں اسکول جا رہا ہوں...'' راجو اپنی ماں سے کہہ کر گھر سے باہر اسکول کے لیے نکل پڑا۔

راجو کا اسکول گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ اکثر پیدل ہی اسکول چلا جاتا۔ رستے میں اسے جو بھی ملتا اسے سلام نمستے کرتا۔ سب لوگ راجو کو بہت پسند کرتے تھے۔ گھر سے کچھ دور چلنے کے بعد ایک مسجد تھی۔ اس کے بعد برگد والا مندر پڑتا تھا۔ پھر کچھ دور چلنے پر میدان تھا۔ جہاں محرم میں تعزیے رکھے جاتے تھے اور دشہرے پر راون کا پتلا لگایا جاتا تھا۔ دراصل بانس سے پتلے تیار کرنے میں حاجی بابو کو مہارت حاصل تھی۔ یہ ان کا پشتینی کام تھا۔ بانس اور کاغذ کی مدد سے وہ طرح طرح کے ماڈل بنانے میں انفرادیت رکھتے تھے۔ راجو جب اسکول جاتا اکثر حاجی بابو سے ملاقات ہو جاتی۔ آج بھی حاجی بابو راجو سے ٹکرا گئے۔

حاجی بابو نے مسکراتے ہوئے کہا ''کیسے ہو راجو؟''

''حاجی جی! آداب عرض ہے...'' راجو نے کہا؟ ''آج کا اخبار پڑھا آپ نے؟''

''نہیں!!! کہاں پڑھا؟ کوئی خاص خبر ہے کیا؟''

''حاجی جی آج کے اخبار میں بہت بڑی خبر آنے والی ہے... سائنس دانوں نے کمال کر دیا ہے۔ رات کی خبر نہیں دیکھی؟''

''کہاں دیکھی میں نے؟ کل رات میں دیر تک کام میں لگا رہا۔ اگلے اتوار وگیان پردرشنی ہے تمھارے اسکول میں بانس کا ماڈل بنا رہا ہوں۔'' حاجی بابو نے جوشیلے انداز میں راجو سے کہا۔

''ماڈل! کیسا ماڈل حاجی جی!''

''ارے پیارے! ایک راکٹ تیار کرنا ہے، جس کو

پر درشنی میں دکھایا جائے گا۔'' حاجی بابو نے ایک تصویر دکھاتے ہوئے کہا۔

یکا یک پیچھے سے سائیکل کی گھنٹی بجی اور آواز بلند ہوئی۔ ''اخبار لے لو حاجی صاحب...'' یہ کوئی اور نہیں خبری لال ہی تھا۔

''بہت دیر کر دی حضور آتے آتے۔''

''ارے صاحب سائیکل میں پنچر ہو گیا تھا۔'' خبری لال نے کہا۔

''خبری چاچا۔ ایک اخبار مجھے بھی دینا... پیسے لوٹ کر دوں گا۔'' راجو اضطرابی کیفیت میں خبری لال سے مخاطب ہوا۔

اخبار کے پہلے پیج پر ہی جیمز ویب دوربین کے ذریعے کھینچی ہوئی رنگین تصویر شائع ہوئی تھی۔ جس کو دیکھ کر راجو کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا جیسے اسے دلی مراد مل گئی ہو۔ راجو نے اخبار بستے میں رکھا اور حاجی صاحب سے اجازت لے کر تیزی سے چل دیا کیونکہ اسے اسکول جانے میں دیر ہو رہی تھی۔

راجو کا آج اسکول میں بھی دل نہیں لگ رہا تھا۔ ریسیس کے وقفے میں بھی اس نے اپنا کھانا نہیں کھایا بلکہ اخبار نکال کر پڑھنے لگا اور کچھ ڈائری میں نوٹ کرنے لگا۔ آج اس کا 'گیان کا پٹارا' مزید نئی نئی معلومات سے بھر گیا تھا۔ لیکن پھر بھی راجو کے من میں ابھی بھی کچھ سوالات باقی تھے، جن کا جواب تو صرف اس کے سائنس کے ٹیچر جمشید صدیقی صاحب ہی دے سکتے تھے۔

گھنٹی بجی اور ریسیس کا وقفہ ختم ہوا۔ سب طالب علم اپنی اپنی جگہ آ کر بیٹھ گئے۔ اب اگلا گھنٹہ وگیان کا تھا۔ سب بچے اپنی اپنی کتابیں اور کاپیاں نکالنے میں مشغول ہو گئے۔ کچھ دیر بعد سائنس کے ٹیچر جمشید صدیقی صاحب کلاس میں داخل ہوئے۔

''گڈ آفٹر نون سر!!! سارے طالب علم ایک ساتھ کھڑے ہو گئے۔''

''گڈ آفٹر نون اسٹوڈنٹس!!!۔ سٹ ڈاؤن۔'' جمشید صدیقی صاحب نے اپنا چشمہ درست کرتے ہوئے کہا۔

لیکن راجو اپنی جگہ کھڑا رہا۔

''کیا ہوا راجو تم بیٹھے کیوں نہیں؟''

''سر میں آپ سے کل کی خبر کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

جمشید صاحب مسکرائے جیسے وہ سوال کیے بنا ہی سب کچھ سمجھ گئے ہوں۔

''ٹھیک ہے راجو! پہلے بیٹھ جاؤ میں آپ کے تمام سوالات کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔'' جمشید صاحب نے بلیک بورڈ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

کچھ دیر بعد جب کلاس میں سناٹا چھا گیا۔ تو جمشید صاحب نے بولنا شروع کیا۔

''بچو! ہماری اس یونیورس میں اَن گنت تارے اور گلیکسیز موجود ہیں۔ جو ہم سے بلین لائٹ ایئرس دور ہیں۔ بگ بینگ کے بعد سے ہمارا یونیورس تیزی سے پھیل رہا ہے۔ اس دوران بہت سے ستارے بنے اور ان کا خاتمہ بھی ہوا۔ ہم جو رات آسمان میں ستارے دیکھتے ہیں یہ بھی ممکن ہے ان میں سے بہت سے ستارے اب ختم ہو گئے ہوں۔ لیکن ان کی روشنی سفر کر کے اب ہمارے پاس زمین تک آئی ہے اس لیے یہ چمکتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ سورج کی روشنی بھی تقریباً 8 منٹ میں زمین تک پہنچتی ہے، یعنی جس سورج کو ہم دیکھ رہے ہوتے ہیں وہ آٹھ منٹ پرانا ہے۔''

تمام طلبہ بڑے غور سے ان باتوں کو سن رہے تھے۔ تبھی خوشبو کھڑی ہوئی اور بولی۔

''سر! اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم ماضی کے سورج کو دیکھ رہے ہیں۔''

''ویری گڈ! خوشبو تم سمجھ گئی۔''

راجو جمشید صاحب کی ساری باتوں کو جلدی جلدی ڈائری میں تحریر کر رہا تھا۔ جب اس نے سب نکات نوٹ کر لیے۔ تو اس نے اپنے سوالات کا پلندہ جمشید صدیقی صاحب کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔ وہ کھڑے ہو کر بڑے ادب سے بولا۔

''سر! کل میں نیوز دیکھ رہا تھا اس میں بڑی دلچسپ خبر تھی، جس میں نیوز ریڈر ایک تصویر کے بارے میں بتا رہے تھے کہ ''جیمز ویب دوربین کی پہلی رنگین تصویر جس میں اربوں سال پرانی کہکشاؤں کی روشنی دیکھی جا سکتی ہے... آج کے اخبار میں بھی اس کے بارے میں خبر آئی ہے۔'' راجو نے اخبار دکھاتے ہوئے کہا۔

''سر! میرے دل میں بہت سے سوالات ہیں جن کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔''

راجو نے ایک ساتھ کئی سوالات کر دیے۔

''او کے!!! راجو ایک ایک کر کے میں تمھارے سارے سوالوں کا جواب دیتا ہوں۔'' جمشید صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''راجو تمھارا سوال یہ تھا کہ جیمز ویب ٹیلی اسکوپ کیا ہے؟ تو بچو سنو! جیمز ویب ٹیلی اسکوپ اب تک کی سب سے بڑی اور طاقتور ٹیلی اسکوپ ہے۔ جس کو تقریباً 10 ارب ڈالر کی رقم سے تیار کیا گیا ہے۔ اس کو ناسا کے ذریعے پچھلے سال 2021 میں دسمبر کے مہینے خلا میں بھیجا گیا تھا۔ اسے اکیسویں صدی کا سب سے بڑا سائنسی کرشمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ امید کی جا رہی ہے کہ اس کی مدد سے سائنس داں یونیورس کے بارے میں نئی نئی معلومات حاصل کر سکیں گے... بچو! کل جو نیوز میں تصویریں دکھائی جا رہی تھی اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ یونیورس کی پہلی سب سے صاف اور رنگین تصویر ہے جو جیمز ویب اسپیس ٹیلی اسکوپ سے لی گئی ہے... امریکی صدر جو بائیڈن کو بھی ایک پریس کانفرنس کے دوران یہ تصویر دکھائی گئی۔ بائیڈن نے اس تصویر کے بارے میں کہا کہ یہ تصویر دنیا کے لیے ایک یاد دہانی ہے کہ امریکہ اب بھی بڑے کام کر سکتا ہے اور امریکی عوام، خصوصاً ہمارے بچوں، کے لیے یہ ثابت کرتی ہے کہ ہم اپنی صلاحیت سے کچھ بھی حاصل کر سکتے ہیں... ناسا کے سربراہ بل نیلسن نے بتایا کہ جو تصویر دکھائی جا رہی ہے وہ 4.6 ارب سال پرانی کہکشاؤں کے گروپ SMACS 0723 کی ہے۔ جو روشنیاں دکھائی دے رہی ہیں ان میں سے کم سے کم ایک 13 ارب سال پہلے کی ہے۔ یعنی بگ بینگ سے صرف 80 کروڑ سال بعد کی۔''

رام پرکاش جو بہت دیر سے کلاس میں خاموشی سے باتیں سن رہا تھا اس نے اپنا ہاتھ اٹھایا۔

''سر میرا ایک سوال ہے۔''

''ہاں رام پرکاش پوچھو۔''

''سر! جیسا کہ آپ نے ابھی بتایا کہ یہ تصویر بگ بھگ 13 ارب سال پہلے موجود کہکشاؤں کی ہے یہ کیسے ممکن ہے؟''

جمشید صدیقی نے اپنا چشمہ درست کرتے ہوئے کہا ''پرکاش! کیا تم جانتے ہو روشنی 186000 میل فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرتی ہے اور جو روشنی آپ اس تصویر میں دیکھ رہے ہو وہ 13 ارب سال کا سفر طے کر کے ہم تک پہنچی ہے۔ اس لیے یہ 13 ارب سال پرانی کہی جا رہی ہے۔ یہ ایک عجوبہ ہے جس کو جیمز ویب دوربین نے قید کیا ہے۔''

جمشید صاحب پھر راجو کو مخاطب کرتے ہوئے بولے ''راجو تمہارا ایک سوال یہ بھی تھا کہ اس دوربین کے اور کیا کیا مقاصد ہیں؟''

''بچو! جیمز ویب ٹیلی اسکوپ کو یوں تو آسمان میں ہر قسم کے مشاہدے کے لیے خلا میں بھیجا گیا تھا اور اس کے دو اہم مقاصد بتائے جا رہے ہیں۔ پہلا موجودہ دور کے سیاروں کا جائزہ لینا اور یہ طے کرنا کہ کیا وہ انسانی رہائش کے قابل ہیں یا نہیں... اور دوسرا کائنات میں سب سے پہلے چمکنے والے ستاروں کی تصاویر حاصل کرنا۔''

پوری کلاس پر ایک سحر کا عالم تھا۔ یہ سحر تب ٹوٹا جب اگلے وقفے کی گھنٹی بجی۔

جمشید صاحب نے چلتے ہوئے کہا ''سوری اسٹوڈنٹس میری دوسری کلاس کا وقت ہو گیا ہے۔ میں کل آپ سے پھر ملاقات کروں گا... '' اور وہ کلاس سے باہر چلے گئے۔

راجو کے چہرے پر ایک اطمنان تھا، کیونکہ اس کو کافی حد تک اپنے سوالات کے جوابات مل گئے تھے۔ وہ اپنے گیان کا پٹارا کھولے اس میں تمام جانکاری کو تحریر کرنے میں مصروف تھا۔ جب کہ اس کے کلاس کے دیگر بچے اخبار میں چھپی تصویر اور خبر کو پڑھ رہے تھے۔

رات کو راجو نے ایک خواب دیکھا کہ وہ ایک راکٹ میں بیٹھا خلائی سفر پر جا رہا ہے۔ جیسے اس نے اپنی دلی مراد پالی ہو۔

(تعارف جون 2021 کے شمارے میں شائع ہوچکا ہے)

■

Er. Mohd Adil
Hilal House, H.No.: 4/114, Jagjeevan Colony
Naglah Mallah, Civil Line
Aligarh - 202002 (UP)
Mob.: 9358856606

Subscription Form "Bachon Ki Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'بچوں کی دنیا' کا رکن سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر.................... بتاریخ.................................

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِتعاون سالانہ -/100 روپے 90092010045326 :A/C، IFSC: CNRB0019009

میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'بچوں کی دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159 , Email.: magazines@ncpul.in

دستخط

کہانی

محمد گلزار عالم

اسکول بکس

عفان بڑی بے چینی سے بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا۔ آج کی رات اسے بڑی لمبی لگ رہی تھی۔ کئی بار اٹھ کر گھڑی کی جانب دیکھا لیکن نائٹ بلب کی روشنی میں اسے گھڑی کی سوئیاں دکھائی نہیں دیں۔ آج کے بچوں کی طرح اس کے پاس موبائل فون نہیں تھا۔ اس کے پاس تو کیا بڑوں کے پاس بھی موبائل نہیں تھے۔ لوگ وقت گھڑی میں دیکھا کرتے تھے۔ اس وقت زندگی بڑی آسان تھی۔ ایک دوسرے کے لیے وقت تھا۔ لوگ بغیر موبائل کے زندگی گزارتے تھے۔ موبائل کلچر کا رواج تو دور، تصور بھی نہ تھا۔ زندگی بڑی پرسکون تھی۔ کتابوں کے مطالعے کا شوق لوگوں کے دلوں میں تھا۔ اس نئی ایجاد نے جہاں زندگی میں آسانیاں پیدا کیں وہیں لوگوں سے بہت کچھ چھین بھی لیا۔ ایک ہی چھت کے نیچے رہ کر لوگ ایک دوسرے سے غافل ہیں۔ ایک ہی کمرے میں بیٹھ کر خاموش ہیں۔ بھیڑ میں بھی خاموشی کا ماحول ہے۔ آج دنیا لوگوں سے بھری پڑی ہے لیکن ہر ایک شخص خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔

عفان کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ وہ صبح ہونے کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ کتنی دیر سے بستر پر پڑا ہے۔ رات کٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ بار بار کروٹ بدلنے اور گھڑی دیکھنے کی کوشش میں اس کی والدہ کی بھی آنکھ کھل گئی۔

'کیا بات ہے بیٹا؟ نیند نہیں آرہی ہے کیا؟ امی نے بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے فرط محبت سے پوچھا۔

'امی! صبح کب ہوگی؟ میں کتنی دیر سے سو رہا ہوں۔'

بیٹے کی بات سن کر امی بستر سے اٹھی اور کمرے کا لائٹ آن کر کے گھڑی کی طرف نگاہ دوڑائی۔ اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔

'ابھی دو بجے ہیں۔ سو جاؤ۔'

عفان کی آنکھوں میں نیند کہاں تھی۔ اسے تو بس صبح ہونے کا انتظار تھا۔ اس کی بے چینی اور بے قراری کی اصل وجہ المونیم کا وہ 'اسکول بکس' تھا جسے اس کے اصرار پر والد نے شام کے وقت بازار سے لاکر اپنے لاڈلے بیٹے کو دیا تھا۔

عفان ایک سرکاری اسکول میں درجہ دوم کا طالب علم تھا۔ جب وہ اسکول پہنچ کر اپنے دوستوں کا بکس دیکھتا تو اسے بھی خواہش ہوتی کہ اس کے پاس بھی کتابیں رکھنے کے لیے اسکول بکس ہوتا جس میں کتابیں بھر کر اسکول آتا۔ ایک سال سے وہ اپنی کتابیں ایک پلاسٹک جھولے میں رکھ کر اسکول جا رہا تھا۔

ایک دن اسکول سے آکر وہ اپنی امی سے اسکول بکس خریدنے کی ضد کرنے لگا۔ اس زمانے میں آج کی طرح اسکول بیگ کا رواج عام نہ تھا۔ بچے المونیم کے چھوٹے سے بکس میں کتابیں لے کر اسکول یا مدرسے جاتے تھے۔

امی اکلوتے بیٹے کی فرمائش سن کر تھوڑی پریشان ہوئی۔ نومبر کی سرد ترین شام میں ان کی پیشانی پر پسینے کے قطرے موتی کی طرح چمکنے لگے۔

بیٹے کو چھاتی سے لگاتے ہوئے بڑے پیار سے بولی:

'ابو سے کہہ کر اپنے شہزادے کے لیے اسکول بکس منگوا

دوں گی۔ دو تین دن رک جاؤ۔‘

امی کے وعدے سے عفان بہت خوش ہوا۔

اس کے والد ایک معمولی درزی تھے۔ پھٹے پرانے اور کبھی کبھار نئے کپڑے سلائی کر کے بمشکل گھر کا خرچ چلاتے تھے۔ اکلوتے بیٹے نے پہلی بار فرمائش کی تھی۔ اس کی فرمائش بہت بڑی نہیں تھی لیکن اس کا انتظام کرنا ان کے لیے پریشانی کا سبب تھا۔ بیٹے کو سرکاری اسکول میں داخل کر کے تھوڑی راحت کی سانس لی تھی کہ یہاں تعلیم مفت دی جاتی ہے۔ صرف یونیفارم اور کاپی پنسل کا انتظام کرنا ہوتا ہے۔ یونیفارم بھی درجہ اول میں ہی عفان کو دیا گیا تھا۔ ایک تعلیمی سیشن مکمل ہوتے ہوتے عفان کی پینٹ پیچھے سے پھٹ گئی تھی۔ ابو نے اپنی فنی کاریگری کا بہترین نمونہ پیش کرتے ہوئے دونوں جانب ایسی نفاست سے پیوند کاری کی تھی کہ عیب نقش میں بدل چکا تھا۔ بیٹا اسے اپنے والد کا ہنر سمجھ کر بے چوں و چرا خوشی خوشی پہننے لگا۔ غربت کا عالم یہ تھا کہ بیٹے کے لیے ایک جوڑی یونیفارم بنانے کے پیسے نہیں تھے ایسے میں ایک مطالبہ نے ان دونوں کی نیند اڑا دی تھی۔

دو دن بڑی بے چینی میں گزرے۔ تیسرے دن کا وعدہ تھا۔ رات بھر والدین کی آنکھوں سے نیند غائب تھی۔ عفان کے والد اور والدہ اپنی جگہ سے اٹھے۔ وضو کیا اور تہجد کی نماز کے لیے کھڑے ہو گئے۔ نماز مکمل کرنے کے بعد عفان کے والد نے اپنے رب سے دعا مانگتے ہوئے صرف اتنا کہا:

’اے میرے رب! تیرے بندے کی عزت اور ایک باپ کا وقار آپ کے پاس امانت ہے۔ اس امانت کی حفاظت اور وقار کی لاج رکھ لے۔‘

صبح ناشتے سے فارغ ہو کر عفان پڑھائی میں مشغول ہو گیا۔ ابو دکان کی طرف چل دیے اور امی گھر کے کام میں مصروف ہو گئیں۔

عفان کے والد نے ابھی دکان کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ ایک شخص ان کی دکان پر آیا اور تھیلی سے کپڑا نکالتے ہوئے بولا۔

’مجھے شام ایک دعوت میں جانا ہے۔ میرے پاس ڈھنگ کا کوئی کپڑا نہیں ہے۔ جو ہے سب پہن چکا ہوں۔ نیا کچھ بھی نہیں۔ اسے لیجیے اور دو پہر تک سلائی کر کے دے دیجیے۔ مہربانی ہوگی۔ آپ کی جو اجرت ہے اس سے کچھ بڑھا کر دے دوں گا۔‘

عفان کے والد نے پہلے تو انکار کیا کہ اتنے کم وقت میں سلائی ممکن نہیں۔ پھر خیال آیا کہ اللہ نے ان کی دعا قبول کر کے بکس خریدنے کا انتظام کر دیا ہے۔

کپڑے ڈیسک پر رکھ کر اس شخص کا ناپ لیا اور شام چار بجے آنے کے لیے کہا۔

ایک جوش اور جذبے کے ساتھ وہ کپڑے کی سلائی کرنے میں مشغول ہو گئے۔ ظہر کی اذان ہوئی۔ نماز سے فارغ ہو کر دوپہر کا کھانا کھانے گھر نہیں گئے بلکہ کپڑے میں بٹن لگانے بیٹھ گئے۔ دل ہی دل میں وہ اپنے رب کا شکریہ ادا کرنے لگے۔

’اے پروردگار آپ نے میری عزت اور وقار کی لاج رکھ لی۔‘

کپڑے پر آئرن دیا اور ڈیسک پر رکھ کر اس شخص کا انتظار کرنے لگے۔

کپڑا دینے والا شخص شاید وقت کا بڑا پابند تھا۔ ٹھیک شام کے چار بجے وہ دکان کی جانب آتا دکھائی دیا۔ دکان پہنچتے ہی اس کی نظر اپنے تھیلے پر پڑی۔ بڑا خوش ہوا کہ وقت پر سلائی کیے ہوئے کپڑے مل گئے۔ جیب سے پرس نکال کر سو روپے کے تین نوٹ بڑھاتے ہوئے بولا:

’آپ کی کاریگری کے 150 روپے کے ساتھ یہ اضافی

رقم خوشی سے دے رہا ہوں۔ اسے رکھ لیجیے۔ آپ نے وقت پر مجھے کپڑا دیا۔ اس کے لیے شکرگزار ہوں۔'

ان کے چہرے پر خوشی کے آثار نمودار ہوئے۔ رقم جیب میں رکھ کر فوراً دکان بند کیا اور بازار کی طرف چل پڑے۔

بازار سے المونیم کا ایک اسکول بکس خریدا جس کی قیمت ایک سو چالیس روپے تھی۔ شام کے وقت کا کچھ ناشتہ بھی بازار سے لے کر گھر کی طرف لپکے۔ خوشی سے ان کے قدم اٹھ نہیں رہے تھے۔ آج بازار سے گھر کی مسافت کچھ زیادہ ہی لگ رہی تھی۔ گھر پہنچ کر عفان کو آواز دی۔

'عفان! بیٹا عفان کہاں ہو۔ دیکھو میں تمھارے لیے کیا لایا ہوں۔

ابو کی آواز سن کر عفان دوڑا ہوا آیا۔ ان کے ہاتھ میں اپنی مطلوبہ چیز دیکھ کر وہ خوشی سے جھومنے لگا اور ابو کے گلے سے لگ کر کہا:

'ابو آپ بہت اچھے ہیں۔'

وہ دوڑتا ہوا امی کے پاس گیا۔

'امی دیکھیے! ابو میرے لیے اسکول بکس لائے ہیں۔'

امی کے ہاتھ میں بکس دے کر وہ میز پر رکھی کتابیں سمیٹنے لگا۔ پیچھے مڑ کر امی کی جانب دیکھا۔ امی اب تک بکس ہاتھ میں لیے کھڑی تھی اور لاڈلے کو دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

کتابیں اٹھا کر وہ امی کے پاس آیا۔ زمین پر بیٹھ کر قرینے سے کتابیں بکس میں سجانے لگا۔ امی ابو دونوں اپنے لخت جگر کو بڑی محبت سے دیکھ رہے تھے۔ اس کی خوشی کا اندازہ لگانے کی کوشش میں جٹے تھے۔ اپنے لاڈلے کو اس قدر خوش دیکھ کر ان کی آنکھیں بھی خوشی کے آنسو سے ڈبڈبا گئیں۔ کتابیں بکس میں رکھنے کے بعد ایک چھوٹا تالا لگا کر جو اس کے ابو بکس کے ساتھ خرید کر لائے تھے، اپنے ننھے ننھے ہاتھوں میں بکس کو اس احتیاط کے ساتھ اٹھایا جیسے کوئی انتہائی نازک اور قیمتی چیز کی حفاظت کر رہا ہو۔

عفان کے لیے آج کی رات کاٹنی مشکل ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ دو دن قبل والدین کے آنکھوں سے نیند غائب تھی، لیکن دونوں میں بڑا فرق تھا۔ ایک کی نیند فکر سے اڑی تھی جبکہ دوسرے کی نیند خوشی میں غائب تھی۔

صبح ہوتے ہی عفان نے خوشی خوشی نہا دھو کر صاف ستھرا یونیفارم پہنا اور ناشتہ کیا پھر سلام کرتے ہوئے وہ اسکول کے لیے نکل پڑا۔

اسکول پہنچتے ہی اس نے اپنے دوستوں کو نیا بکس دکھایا۔ بنچ پر بکس رکھنے سے پہلے پاکٹ سے رومال نکال کر بینچ کی صفائی کی۔ رومال موڑ کر پاکٹ میں رکھا اور بکس رکھ کر بیٹھ گیا۔ اسکول میں چار پریڈ مکمل ہونے کے بعد ٹفن کے لیے چھٹی ہوئی۔ عفان بکس چھوڑ کر گھر نہیں جانا چاہتا تھا، لیکن ٹفن کے وقت کتابیں گھر لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ناچار وہ گھر آیا۔ ہاتھ منہ دھو کر جلدی جلدی کھانا کھایا اور امی کو سلام کرتے ہوئے لپک کر باہر نکل گیا۔ اسے بکس کی فکر لگی ہوئی تھی اور اسی فکر کے ساتھ وہ اسکول پہنچا۔ مین گیٹ میں تالا لگا تھا۔ اندر کچھ بچے کھیل رہے تھے۔ چابی ہیڈ ماسٹر صاحب کے پاس تھی۔ وہ ابھی گھر سے نہیں آئے تھے۔ عفان اپنے کلاس والی کھڑکی کے پاس پہنچا۔ کھڑکی سے اندر کا نظارہ دیکھتے ہی اس کے پیروں تلے زمین کھسک گئی۔ کلاس کا مونیٹر ببلو تمام بچوں کا بکس ایک کے اوپر ایک لگا کر دس منزلہ عمارت کھڑی کر چکا تھا۔ اوپر میں عفان کا بکس رکھا تھا۔ وہ کیا کرنا چاہ رہا تھا عفان ابھی یہ سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ ببلو دوسرے لڑکوں کی مدد سے اپنا ایک پاؤں بکس پر رکھ چکا تھا۔

عفان نے زور زور سے آواز لگائی۔

میرا بکس، بلو میرا بکس، نیچے رکھ دو، کل ہی میرے ابو لا کر دیے ہیں، ٹوٹ جائے گا۔'

اس کی فریاد کلاس میں بازگشت کی طرح گونج رہی تھی، لیکن مونیٹر کو ذرا بھی رحم نہیں آیا اور اس نے وہی کیا جو اسے کرنا تھا، بکس پر چڑھ کر خود کو اونچا محسوس کرنے لگا۔ اس کے عمل سے اوپر کے تین چار بکس کی حالت خراب ہوگئی۔ اوپر عفان کا ہی نیا بکس تھا۔ وہ کچھ زیادہ ہی متاثر ہوا تھا۔ اسکول گیٹ کھلتے ہی وہ دوڑ کر اندر آیا۔ بکس کو اٹھا کر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے زار و قطار رونے لگا۔ رونے کی آواز سن کر ہیڈ ماسٹر صاحب کلاس میں آئے۔ رونے کی وجہ پوچھی۔ عفان نے ہچکی لیتے ہوئے پوری بات بتائی۔ ہیڈ ماسٹر صاحب کو بہت غصہ آیا۔ مونیٹر کو ایک زناٹے دار طمانچہ رسید کرتے ہوئے ہتھوڑی لانے کے لیے کہا۔

بکس بیچ سے بالکل اندر کی جانب دھنس چکا تھا۔ وہ اسے ٹھیک کرنے میں مصروف ہوگئے۔ ہتھوڑی جس قدر بکس پر مارتے اس قدر درد عفان کو ہوتا۔ کسی طور سے بکس سیدھا تو ہو گیا لیکن اپنی اصلی حالت سے محروم ہو چکا تھا۔ عفان کو اب کلاس میں بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ تین پریڈ پڑھائی ہوگئی تھی۔ ٹیچر نے کیا پڑھایا اسے کچھ خیال ہی نہیں رہا۔ بس وہ ایک ٹک اپنے بکس کو دیکھے جا رہا تھا۔ گھنٹی کی آواز کے ساتھ ہی بچے کلاس سے بھاگنے لگے۔ چھٹی ہو چکی تھی۔ عفان پژمردہ حالت میں اپنی ٹوٹی خواہش ہاتھ میں اٹھائے بوجھل قدموں سے گھر کی طرف بڑھنے لگا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا اس چھوٹی سے عمر میں اس کی کل کائنات لٹ گئی ہو۔ جس خوشی کے ساتھ وہ اسکول آیا تھا اس سے بھی کہیں زیادہ غمگین انداز میں بوجھل قدموں کے ساتھ گھر میں داخل ہوا۔

امی سامنے بیٹھی تھی۔ ان کے پاس بکس رکھ کر زار و قطار رونے لگا۔

'امی میری کوئی غلطی نہیں ہے۔ میں نے اسے روکنے کی پوری کوشش کی لیکن وہ میری ایک بھی نہیں سنا اور بکس کی یہ حالت کر دی۔'

امی اب تک کچھ سمجھ نہیں پائی تھی۔

عفان آنسو کے قطرے بہائے جا رہا تھا۔

'میں ابو کو کیا جواب دوں گا؟'

وہ پھر سسک سسک کر رونے لگا۔ امی عفان کے آنسو آنچل سے پوچھتے ہوئے بولی:

'بات کیا ہے؟ بکس کی حالت اس طرح کیسے ہوئی۔'

عفان نے پورا ماجرا سنایا۔

'امی! میں اپنے کلاس کی کھڑکی کے پاس بے بس کھڑا ہو کر یہ سب دیکھتا رہا۔ میں کچھ نہ کر سکا۔ گیٹ میں تالا لگا تھا۔ میں بکس کو بچا نہ سکا۔ میں مجبور تھا۔ امی میں بے قصور ہوں۔'

اتنا کہہ کر وہ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بیٹے کو اس طرح روتے دیکھ کر امی کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہوگئے۔

روتے روتے عفان امی کی گود میں ہی سر رکھ کر سو گیا۔

شام کے وقت جب ابو گھر آئے تو سناٹا چھایا ہوا تھا۔

بیگم سے عفان کے بارے میں پوچھا۔

بیگم نے پوری کہانی شروع سے آخر تک بیان کی۔

انھیں بھی افسوس ہوا کہ کتنی چاہت سے 'شہزادے' کی خواہش پوری کی تھی، لیکن شرارتی کی شرارت نے ان کی محنت پر پانی پھیر دیا۔

■

Mohd Gulzar Alam
Rel Paar, Jahangeeri Mohalla
Asansol- (West Bengal)
Mob.: 9563742626

شیخ فرحان رؤف

زندگی کے اتار چڑھاؤ

کردار:

کامران: (غریب گھر کا لڑکا)

اختر: (کامران کا ہم جماعت دوست)

استاد جی: (کامران اور فیصل کے استاد)

امی: (کامران کی بوڑھی ماں)

(پہلا منظر)

(صبح سات بجے کا وقت ہے، کامران اور اختر ساتھ میں اسکول کے لیے جاتے ہوئے۔ کامران مایوس نظر آتا ہے۔)

اختر: کیا ہوا ہے؟ اتنے مایوس کیوں نظر آرہے ہو؟ (کامران سے پوچھتے ہوئے)

کامران: مایوس نہیں ہوں بس فکر ہو رہی ہے کیونکہ آج امتحان کے نتائج آنے والے ہیں۔

اختر: (مسکراتے ہوئے) تو اس بات پر مایوس ہونے کی کیا ضرورت ہے۔

کامران: (غصے سے) تم بہت لاپرواہ ہو تمھیں ذرا بھی نتائج کی فکر نہیں ہے۔

اختر: معاف کردو بھائی، میں نے مذاق کیا تھا مجھے بھی فکر ہو

رہی ہے لیکن اب جلدی بھی چلو ورنہ استاد جی ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی نتائج کے پرچے نا بانٹ دیں۔

(دوسرا منظر)

(کلاس روم کا منظر جہاں استاد جی بچوں کو امتحان کے نتائج کے پرچے بانٹ رہے ہیں۔ کامران اور اختر اپنے اپنے پرچے دیکھتے ہوئے۔)

اختر: (کامران سے پوچھتے ہوئے) کامران بتا تُجھے کتنے نمبر آئے ہیں؟

کامران: نہیں پہلے تو بتا تُجھے کتنے نمبر آئے ہیں؟

اختر: ٹھیک ہے بھائی پہلے میں ہی بتا دیتا ہوں۔ مُجھے 39% فیصد ملے ہیں۔

کامران: (مایوسی کے ساتھ) مُجھے محض 38% فیصد ملے ہیں۔

اختر: (کامران کو حوصلہ دیتے ہوئے) کوئی بات نہیں بھائی پاس تو ہو گیا ہے نا۔

کامران: (مایوسی کے ساتھ) محض پاس ہونے سے کیا ہوتا ہے۔

اختر: اب بس بھی کر بھائی! چل اسکول کے بعد ice Cream کھانے چلتے ہیں؟

کامران: (مایوس ہو کر) نہیں میں نہیں آ رہا ہوں۔

اختر: ارے بھائی چلنا بہت اچھی Cream ice ملتی ہے چاچا کی دکان پر۔

کامران: (غصّے سے) میں نے کہا نا کہ مُجھے نہیں آنا ہے۔

اختر: (ڈر کے ساتھ) ٹھیک ہے! ٹھیک ہے!

(اسکول چُھٹنے کی گھنٹی بجتی ہے اور کامران اداس ہو کر اکیلا ہی گھر کے لیے چلا جاتا ہے۔)

(تیسرا منظر)

(شام کا وقت ہے۔ اختر کے گھر پر کامران کی امّی آتی ہے)

امی: (فکر کے ساتھ) اختر! اے بیٹا اختر!

(اختر اپنے کمرے سے باہر آتا ہے)

اختر: خالہ جان آپ یہاں اور اس وقت! سب خیریت تو ہے؟

امی: کامران کہاں ہے بیٹا؟

اختر: وہ میرے ساتھ نہیں ہے۔

امی: کیا! وہ تمھارے ساتھ نہیں ہے؟

اختر: (حیران ہو کر) جی وہ میرے ساتھ نہیں ہے۔

امی: لیکن صبح تو وہ تمھارے ساتھ اسکول گیا تھا اور ابھی تک گھر نہیں لوٹا ہے۔

اختر: (حیران ہو کر) کیا! وہ ابھی تک گھر نہیں لوٹا ہے؟

امی: (پریشان ہو کر) ہاں بیٹا وہ ابھی تک گھر نہیں آیا۔ تم دونوں ساتھ میں اسکول کے لیے جاتے ہو تو مجھے لگا کہ وہ تمھارے ساتھ ہوگا۔

اختر: جی نہیں خالہ جان وہ مُجھ سے پہلے گھر کے لیے روانہ ہو گیا تھا میں نے اسے روکا بھی ساتھ چلنے کے لیے لیکن اس نے میری بات نہیں سنی۔

(کامران کی امی زور زور رونے لگتی ہے)

امی: ہائے میرے اللہ! کہاں گیا میرا لال؟ نہ جانے وہ کس حال میں ہوگا؟

اختر: (امی کو چپ کراتے ہوئے) خالہ جان روئیے مت، وہ ٹھیک ہوگا۔ میں ابھی استاد جی کو خبر کرتا ہوں، وہ ضرور اسے ڈھونڈ لیں گے۔

(اختر استاد جی کو فون پر پورا معاملہ بتا دیتا ہے۔ استاد جی کامران کو ڈھونڈنے کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں)

(چوتھا منظر)

(سورج غروب ہو چکا ہے۔ استاد جی کامران کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے ایک باغیچے کے پاس آ پہنچتے ہے

اور کامران استاد جی کو ایک درخت کے نیچے اکیلا بیٹھا ہوا نظر آتا ہے۔ استاد جی خاموشی سے کامران کے قریب جاتے ہے۔)

کامران: (بچک کر) استاد جی آپ یہاں؟

استاد جی: (کامران کے پاس بیٹھ جاتے ہیں) تم اتنے اندھیرے میں اکیلے کیوں بیٹھے ہو؟

کامران: (ہچکچاہٹ کے ساتھ) وہ بات ایسی ہے استاد جی!

استاد جی: (کامران کی بات بیچ میں روک کر) مجھے معلوم ہے کہ تم یہاں اکیلے کیوں بیٹھے ہو، اختر نے مجھے سب بتا دیا ہے۔

کامران: اختر نے آپ کو سب کچھ بتا دیا؟

اُستاد جی: (مسکرا کر) ہاں اس نے مجھے بتا دیا کے تم اپنے امتحان کے پرچے میں کم فیصد آنے کی وجہ سے کتنے مایوس ہو اور اسی وجہ سے تم اسکول سے گھر بھی نہیں لوٹے۔ (استاد جی کامران کے سر پر ہاتھ رکھ کر سمجھاتے ہوئے) دیکھو بیٹا زندگی میں اتار چڑھاؤ ہوتے رہتے ہیں یہاں انسان کبھی بہت خوش ہوتا ہے تو کبھی بہت مایوس ہوتا ہے، مایوس صرف اس لیے ہوتا ہے کیونکہ انسان کو اس کی خواہش کے مطابق کوئی چیز نہیں ملتی لیکن وہ چیز اس کو مل جائے اگر وہ پچھلی ناکامیوں سے سبق حاصل کر کے آگے زیادہ محنت کریں۔ کروگے محنت؟ (کامران سے پوچھتے ہوئے)

کامران: لیکن استاد جی اگر میں محنت کرنے کے بعد بھی کامیاب نہ ہو پایا تو؟

استاد: (مسکراتے ہوئے) بیٹا کبھی ایک چیونٹی کو کھانا لے جاتے ہوئے دیکھا ہے؟ (کامران سے سوال کرتے ہوئے)

کامران: نہیں استاد جی۔

استاد: جب چیونٹی اپنی غذا کو لے جاتی ہے تو وہ غذا اس سے کئی بار گر جاتی ہے کیونکہ وہ اس چیونٹی کے وزن سے بھاری ہوتی ہے۔ لیکن چیونٹی کبھی اس غذا کو چھوڑ کر نہیں جاتی ہے۔ مسلسل کوششوں سے وہ اس غذا کو اپنی منزل تک پہنچا ہی دیتی ہے۔ تو بتاؤ بیٹا اس سے ہم کیا سیکھتے ہیں؟ (کامران سے سوال کرتے ہوئے)

کامران: (آنکھوں میں ایک الگ سی چمک کے ساتھ) یہی کہ زندگی میں کبھی ہار نہیں ماننی چاہیے، کوشش کرتے رہنا چاہیے جب تک کہ مقصد حاصل نہ ہو جائے۔

استاد جی: (خوشی کے ساتھ) اسی طرح اگر امتحانات میں کم نمبر ملے تو اس بات پر مایوس نہیں ہونا چاہیے بلکہ اپنی غلطیوں کو تلاش کر کے ان غلطیوں کو درست کرنا چاہیے نہ کہ اس پر افسوس کرتے بیٹھے رہنا چاہیے۔

کامران: (جوش کے ساتھ) جی استاد جی میں خوب محنت کروں گا اور اگلی بار پورے اسکول میں سب سے اچھے نمبر لاؤں گا۔

استاد جی: ہاں کامران خوب محنت کرنا لیکن ابھی گھر چلو کیونکہ تمھاری امی تمھارا انتظار کر رہی ہے۔

(استاد جی کامران کو گھر چھوڑ دیتے ہیں اور کامران کی امی کامران کو اپنے سینے سے لگا لیتی ہے۔)

■

Shaikh Farhan Rauf
Islampura, Bhiwani Peeth
Distt: Jalgaon - 425001 (Maharashtra)
Mob.: 7387677175

ہوا محل

محمد اکرام

بچپن کے دن واقعی بہت حسین ہوتے ہیں، کیونکہ اس عمر میں بچے ہر طرح کی پابندیوں اور ذمہ داریوں سے آزاد ہوتے ہیں۔ ہمارے بچپن میں سارا دن باغوں، تالابوں، ندی نالوں، کھیت کھلیانوں وغیرہ کے سیر و تفریح میں گزر جاتا۔ اس درمیان ہم جیسے بچے معصوم قسم کی شرارتیں بھی کرتے۔ دن بھر کی سیر و تفریح کے بعد تھکاوٹ سے چور ہو کر جب ہم گھر کو واپس ہوتے تو وہ پل اور بھی حسین ہوتے تھے کیونکہ سوتے وقت گھر کی بزرگ خواتین چاہے وہ دادی اماں ہوں یا نانی اماں اپنی گود میں بٹھا کر مختلف قسم کی کہانیاں سناتی تھیں۔ کبھی راجا رانی کی، تو کبھی بادشاہ اور وزیروں کی، کبھی دیو پری کی تو کبھی شیر بھالو وغیرہ کی، الغرض یہ کہانیاں سنتے سنتے ہمیں کب نیند آجاتی، احساس بھی نہ ہوتا۔ اسی طرح کی کہانیوں کے خالق ہیں منظور وقار جنھوں نے 'ہوا محل' میں بچوں کے ذوق و شوق کا خیال رکھتے ہوئے یہ کتاب ترتیب دی ہے۔ منظور وقار کا تعلق گلبرگہ کرناٹک سے ہے۔ منظور صاحب بڑوں کے ساتھ بچوں کے لیے بھی لکھتے رہے ہیں۔ 'ہوا محل' منظور وقار کا بچوں کے لیے لکھی گئی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ہے جس میں 13 کہانیاں: عقل مند ماں، ہوا محل، خوشامد پسند بادشاہ، اور گھمنڈ ٹوٹ گیا، قیمتی تحفہ، اندر کا خوف، سب سے بڑا جھوٹ، ذہین ملکہ، مشاورتی اجلاس، ندامت کے آنسو، پہلی درس گاہ، حقیقی شہنشاہ اور بلند مقام شامل ہیں۔ 'ہوا محل' کی زیادہ تر کہانیاں بچوں کے رسائل ماہنامہ 'کھلونا'، ماہنامہ 'امنگ'، ماہنامہ 'نرالی دنیا'، ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' میں شائع ہو چکی ہیں۔ یہ کہانیاں 1986 سے لے کر 2021 کے درمیان لکھی گئی ہیں۔ مجموعے میں شامل بیشتر کہانیاں بادشاہوں، راجاؤں اور ان کے چالاک اور عیار وزیروں کی ہیں جہاں وہ اپنے بادشاہ کو خوش رکھنے کے لیے چاپلوسی اور خوشامد پسندی کرتے نظر آتے ہیں۔ مگر کچھ وزرا ایسے بھی ہیں جو بادشاہ کو صحیح راستہ دکھانے کے لیے مختلف حربے استعمال کرتے ہیں۔

مجموعے میں شامل کہانی 'خوشامد پسند بادشاہ' ایک عبرت آموز کہانی ہے جس میں بادشاہ اپنے مکار وزیروں کی زبانی اپنی خوشامد اور جھوٹی تعریفیں سن کر یہ سوچنے لگتا ہے کہ اس سے جتنے کام ہو رہے ہیں بہت اچھے ہیں مگر بادشاہ کا اکلوتا بیٹا ہارون ملک اپنے باپ کے ذریعے کیے جا رہے فیصلوں سے بہت دکھی رہتا تھا۔ وہ اپنے باپ کو صحیح راستہ دکھانے کی مختلف تدبیریں سوچا کرتا تھا۔ بالآخر بیٹے کو اس وقت موقع مل گیا جب بادشاہ نے ایک دن اپنے وزیروں کو حکم دیا کہ اس کے دربار کی بہتر ڈھنگ سے عکاسی کرنے کے لیے شہر کے بہترین فنکاروں کو جمع کیا جائے۔ بادشاہ کے حکم کی تعمیل کی گئی، شہر بھر سے مصوروں کو جمع کیا گیا جنھوں نے اپنے جوہر کا نمونہ پیش کیا۔ بادشاہ کا بیٹا جو نقلی داڑھی اور مونچھ لگا کر بہ طور مصور اس کمپٹیشن میں شامل ہوا تھا اس نے اپنی ذہانت اور ہنر مندی سے بادشاہ کی جگہ گدھا اور اس کے وزیروں کی جگہ کتے کو بٹھا دیا، جنھیں خوبصورت لڑکیاں پنکھا جھل رہی ہیں۔ یہ دیکھتے ہی بادشاہ غصے سے کانپنے لگا اور اسے سخت سے سخت سزا دینے کی بات کہی گئی۔ یہاں تک کہ آخر میں پھانسی دینے کا اعلان ہوا، مگر کچھ اچھے وزیروں نے اس کی مخالفت کی۔ آخر میں بادشاہ کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہوا، اس مصور سے تعارف کروانے کو کہا جب اس مصور نے اپنے چہرے سے نقلی داڑھی اور

مونچھیں اتاریں تو بادشاہ حیرت میں پڑ گیا کیونکہ یہ اس کا بیٹا تھا۔

'قیمتی تحفہ' بھی ایک سبق آموز کہانی ہے جس میں ایک بادشاہ کو اپنی رعایا سے زیادہ دولت سے محبت ہوتی ہے۔ راجا کو راہ راست پر لانے کے لیے مہاراجہ کی بیوی اور اس کے وزیر ہوشیار سنگھ کے ذریعے اختیار کی گئی تدبیر کو مصنف نے بہتر انداز میں پیش کیا ہے۔

'عقل مند ماں' میں کسان، اس کی بیوی اور اس کے چار بیٹوں کا ذکر ہے۔ کسان کے چاروں بیٹے کاہل، سست اور لاپرواہ تھے۔ دن بھر آوارہ گردی اور فضول کاموں میں بیت جاتا تھا۔ اچانک ایک دن باپ کا انتقال ہو جاتا ہے۔ پھر بھی ان میں کوئی سدھار نہیں ہوتا ہے۔ ماں انھیں راہ راست پر لانے کے لیے ایک تدبیر سوچتی ہے اور کہتی ہے کہ میرے بیٹو! تمھارے باپ نے مرنے سے پہلے مجھے بتایا تھا کہ کھیت میں کافی مقدار میں سونا دفن ہے، تم اس کی کھدائی کرو اور تلاش کرو کہ سونا کہاں ہے۔ کافی مشقت کے بعد انھیں ایک صندوق ملا جس میں ایک کاغذ کے پرزے پر لکھا تھا کہ 'سونا باؤلی کی تہہ میں دفن ہے'۔ انھوں نے باؤلی کا تمام پانی نکال کر کھیت میں بہا دیا۔ اب انھیں ایک چھوٹا سا ڈبہ ملا جس میں ایک چٹھی تھی، اس میں لکھا تھا 'سونا تمھیں بازار میں مل جائے گا'۔ اتنی محنت و مشقت کے بعد انھوں نے کھیت کو اس لائق بنا دیا تھا کہ فصل اگائی جا سکے۔ آخر کار ان کی محنت و مشقت سے اس سال ان کے کھیت میں سب سے زیادہ اناج پیدا ہوا جسے بیچ کر یہ خوش حال زندگی گزارنے لگے۔ آخر میں ماں نے بچوں سے کہا کہ میں نے ہی کھیت میں صندوق اور باؤلی کو چھپایا تھا تاکہ تم لوگوں کو راہ راست پر لا سکوں۔ اس مجموعے میں شامل دیگر کہانیاں بھی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔

'ہوا محل' میں شامل تمام کہانیوں میں بچوں کے لیے نصیحتیں بھی ہیں اور عبرت آموز قصے بھی، سچائی اور نیکی کے راستے پر چلنے کی تلقین بھی ہے تو جھوٹ اور ریاکاری سے بچنے کی تدبیر بھی۔ ان کہانیوں کا مقصد ہی بچوں کی اصلاح اور تربیت ہے۔ منظور وقار

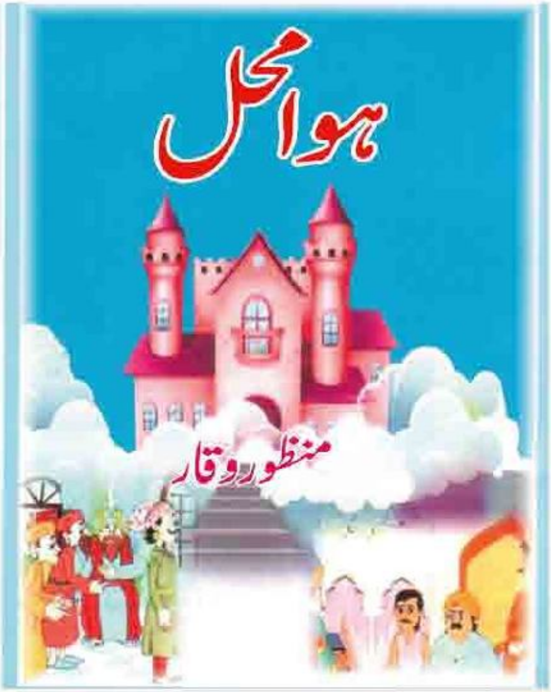

ہوا محل مصنف: منظور وقار، صفحات: 64، قیمت: 50، سنہ اشاعت: 2021، ناشر: رحمانی پبلی کیشنز، 1032 انصار روڈ، چاندنی چوک، ڈاکٹر سراج احمد کے دواخانے کے سامنے، اسلامپورہ، مالیگاؤں، مہاراشٹر موبائل: 9890801886

صاحب نے اپنے انٹرویو میں ڈاکٹر غضنفر اقبال کے سوال کا جواب دیتے ہوئے صحیح کہا ہے کہ "میں بچوں کی کہانیاں لکھتے وقت اس بات کا خیال رکھتا ہوں کہ میری کہانیوں سے بچوں کے اخلاق سدھر جائیں، انھیں اچھے برے کا فرق معلوم ہو جائے... ان میں ایمانداری، سچائی، بہادری، شجاعت اور حب الوطنی کا جذبہ پیدا ہو جائے۔"

منظور وقار صاحب کی یہ کاوش لائق ستائش ہے۔ گو کہ یہ کہانیاں موجودہ دور کے بچوں کی ذہنی سطح سے میل نہیں کھاتیں، کیونکہ آج کے بچے ٹیکنالوجی بیسڈ کہانیاں زیادہ پسند کرتے ہیں۔ پھر بھی یہ کہانیاں بچوں کے لیے سبق آموز ہیں۔

■

Mohd Ikram
89/6A, Street No.: 1
Ghaffar Manzil, Jamia Nagar
New Delhi - 110025
Mob.: 9873818237

اسٹارفش

'اسٹار فش' اور 'سی ارچن' اگرچہ دیکھنے میں مختلف نظر آتی ہیں لیکن دونوں ہی واحد 'فائلم' سے ہیں۔

ایک عام اسٹارفش جیسے برطانیہ کے ساحلوں پر ملنے والی 'Asterias Rubens' بالکل تارہ کی طرح پانچ نوکیلے سروں والی ہوتی ہے۔ ہر طرف سے تقریباً چھ انچ لمبی اور درمیان میں ایک انچ موٹی ہوتی ہے۔ اس کا رنگ بھورا ہوتا ہے اور مرکز میں ایک چھید ہوتا ہے۔

اسٹارفش کی کئی قسمیں ہیں جو ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ کچھ چپٹی ہوتی ہیں۔ کچھ شکل اور حجم میں 'بن' جیسی ہوتی ہیں۔

سی ارچن (Sea-Urchins): سی ارچن بھی بن جیسی ہوتی ہیں۔ ان کے اوپر خارپشت کی طرح بال ہوتے ہیں۔ برطانیہ کے ساحل پرEchinus Esculentus نسل کی سی ارچن بہت عام ہیں۔

بعض 'سی ارچن' قلب یا دل کی شکل والی (Heart Shaped) ہوتی ہیں۔ ایسی 'سی ارچن' چونے والی ساحلی پہاڑیوں، کے باقیات میں اکثر پائی جاتی ہیں۔ گول اور انڈا نما شکل کی 'ارچن' اسٹارفش سے زیادہ لمبی ہوتی ہے۔

اکثر سی ارچن، بالکل ہی حرکت نہیں کرتیں۔ اپنے مٹیالے رنگوں کی وجہ سے دوسری مچھلیوں کے شکار ہونے سے محفوظ رہتی ہیں۔ ان کا شکار کرنے والے ان کے سمندری آبی دشمن ان کے گودے دار (Pulpy) جسم کی نرمی کی وجہ سے ان کا شکار کرتے ہیں۔

اسٹارفش اور 'سی ارچن' دونوں ہی گرمیوں میں لاتعداد انڈے دیتی ہیں۔ ان انڈوں کو دوسرے آبی جاندار ہڑپ

کرجاتے ہیں اور بہت کم بچے ہوتے ہیں۔

سن فش (Sun Fish): سن فش کیا ہے— بہت بڑا سر اور بہت ہی چھوٹا سا جسم عجیب سی، چوکور سی ہیئت کے علاوہ بس دونوں بغلوں میں دو ڈینے (Fins) ہوتے ہیں۔ یہ مچھلی تقریباً گول نما ہوتی ہے۔ تقریباً 8 فٹ لمبی اور وزن اس قدر کہ ایک ٹن تک کی سن فش پکڑی جا چکی ہے۔

سن فش کا نام یوں پڑا کہ یہ سمندری پانی کی اوپری سطح پر خود کو ڈال کر، گھنٹوں بے حس وحرکت دھوپ کھاتی ہے۔ اس کا شکار اس سے چربی حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ کشتی میں بیٹھے، اس کی طرف بڑھنے والے شکاریوں کا یہ بالکل خیال نہیں کرتی— اور اس طرح آسانی سے شکار ہو جاتی ہے۔ اکثر زبردست لڑائی بھی کرتی ہے۔ اس وقت اپنے دونوں ڈینوں کو خوب زور زور سے پانی کی سطح پر مارتی ہے— اور شکاریوں کی کشتی کو کھینچ کر بہت دور لے جاتی ہے۔ سن فش، بحر اٹلانٹک اور بحر پیسیفک میں کافی تعداد میں پائی جاتی ہیں۔ اس کی ایک قسم Mola Mola کبھی کبھی جزائر برطانیہ کے ساحلوں پر بھی نظر آتی ہے۔ یہ رُوپہلے مٹیالے رنگوں سے لے کر ہلکے بھورے رنگوں میں ملتی ہے۔

سورڈ فش (تلوار نما مچھلی) Sword Fish: کھلے سمندروں کا ایک زبردست غنڈا اور مردم آزار 'سورڈ فش' ہے، جو اپنی ناک کی دونوں اطراف سے لمبے تلوار نما ہتھیار نکالے— ہمہ دم اپنے دشمنوں پر حملہ آور ہونے یا ان کا مقابلہ کرنے کو تیار رہتی ہے۔ 'سورڈ فش' (Xiphias Gladius) نسل سے ہے۔ یہ سب سے زیادہ بحیرۂ روم میں پائی جاتی ہے اور، بحر اٹلانٹک اور بحر پیسیفک میں بھی پائی جاتی ہے اور کبھی کبھی برطانیہ کے ساحلوں سے دور بھی نظر آتی ہے۔ یہ 15 سے 20 فٹ تک لمبی ہوتی ہے۔ اس کا رنگ اوپر سے نیلا اور نیچے سے روپہلا ہوتا ہے۔

اس کی تلوار ہڈی سے بنی ہوتی ہے جو اوپری جبڑے سے نکلتی ہے۔ یہ تلوار بہت تیز اور نوکیلی ہوتی ہے۔

نیوزی لینڈ کے ساحل سے دور، سمندر میں یہ مچھلی لوگوں کی دل بستگی کا سامان ہے۔ اکثر لوگ ڈور اور کانٹوں سے ایک معمولی مچھلی لٹکا کر اس کا شکار کرتے ہیں۔

تارپیڈو فش (Torpedo-Fish): یہ مچھلی کیا ہے، گویا ایک زندہ برقی سیل (Living Electric Battery) ہی ہے۔ یہ مچھلی Torpedinudae نسل سے ہے۔ یہ کئی قسموں کی ہوتی ہیں۔ اس کی بیڑی کو دھارا (لہر) یا کرنٹ اس کے سر سے ملتا ہے۔ مچھلی کا اوپری سرا مثبت قطب ہوتا ہے اور نچلا سرا منفی قطب۔ جب یہ پانی سے باہر ہوتی ہے، اگر اس کے دونوں قطبوں کو (مَس) کیا جائے تو بجلی کی لہر (دھارا) (Current) کو محسوس کیا جاسکتا ہے، لیکن پانی کے اندر یہ مثل ایک موصل (Conductor) کے ہوتی ہے۔ وہاں صرف ایک قطب ہی لہر پیدا کرنے کے لیے ضروری (کافی) ہے۔ تارپیڈو فش، اپنی طاقت کا استعمال (یعنی بجلی کی لہر کا خارج کرنا) صرف دفاع کے لیے نہیں کرتی بلکہ یہ اپنے شکار کو کرنٹ لگا کر مار ڈالتی ہے۔ یہ دَم سادھے پانی کی سطح پر خود کو بے حس وحرکت ڈالے رہتی ہے، جب تک کہ کوئی شکار اس کے بہت قریب نہ آجائے۔

جزائر برطانیہ کے ساحل پر یہ شاید ہی کبھی نظر آتی ہے۔ لیکن بحیرۂ روم اور آسٹریلیا کے ساحلوں پر خوب نظر آتی ہے۔ یہ شمالی امریکہ میں بحر اٹلانٹک کے ساحلوں سے دور دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ چار فٹ تک لمبی ہوتی ہے۔

■

ماخذ: آؤ سمندروں کی سیر کریں، **مصنف:** محمد شمس الحق، **دوسری طباعت:** 2008، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

سیتا پھل اور ہزار فائدے

رونق جمال

صحت ہی زندگی ہے، یہ مہاتما گاندھی نے کہا تھا۔ کچھ اسی طرح کی بات اردو کے ایک شاعر نے بھی کہی ہے:

تنگ دستی اگر نہ ہو سالک
تندرستی ہزار نعمت ہے

صحت اور تندرستی زندگی کے لیے بہت لازمی ہیں۔ ذہنی صحت کے لیے جسمانی صحت کی ضرورت پڑتی ہے اسی لیے اگر شروع سے ہی صحت اور تندرستی کے تعلق سے لاپرواہی کے بجائے بیداری کا رویہ اختیار کیا جائے تو انسان بہت ساری بیماریوں سے بچ سکتا ہے۔ ہمارے عہد میں بچوں کی صحت ایک بڑا مسئلہ ہے، اس پر سنجیدگی سے توجہ دیے جانے کی ضرورت ہے۔ بچوں کی صحت کے تعلق سے 'بچوں کی دنیا' میں یہ کالم اس لیے شروع کیا گیا ہے تاکہ والدین کے ساتھ ساتھ بچے خود بھی اپنی صحت اور تندرستی کا خیال رکھ سکیں۔

ویسے تو اللہ تعالیٰ نے سیکڑوں پھل پیدا کیے ہیں جن سے انسان فیض یاب ہوتا رہتا ہے۔ جو غذائیات کی بے شمار قوت اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہوتے ہیں جن کے کھانے سے پیٹ تو بھر ہی جاتا ہے لیکن ساتھ کئی وٹامن بھی ہمارے جسم میں جا کر جسم کی ضرورتوں کو پورا کر دیتے ہیں۔ ان تمام پھلوں میں سے ایک پھل ہے جس کا نام ہے 'سیتا پھل'۔ سیتا پھل ہندوستان میں تقریباً ہر جگہ مل جاتا ہے۔ ہندی میں اسے سیتا پھل کہتے ہیں اردو میں شریفہ اور انگریزی میں Custard Apple کہتے ہیں۔ سیتا پھل سال میں ایک بار صرف سردیوں کے موسم میں آتے ہیں۔ پہلے یہ جنگلی پھل کہلاتا تھا کیونکہ سیتا پھل صرف جنگلوں پہاڑوں اور بنجر زمینوں پر ہی دکھائی دیتے تھے لیکن اب باقاعدہ سیتا پھل کے باغات لگائے جا رہے ہیں۔ آج کل چھوٹے موٹے کسان بھی چند پیڑ اپنے کھیتوں کے کنارے لگا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ باغات سے حاصل کیے جانے والے سیتا پھل غیر ممالک میں اچھے داموں پر فروخت ہوتے ہیں۔ آج بھی جنگل اور پہاڑوں سے حاصل کیے ہوئے سیتا پھل مارکیٹ میں بآسانی مل جاتے ہیں۔ باغات کے سیتا پھلوں کے مقابلے جنگل اور پہاڑوں سے لائے گئے سیتا پھل زیادہ ذائقے دار ہوتے ہیں۔ ایک طرح سے مزدوروں کے لیے سردی کا یہ موسم روپے کا موسم بن جاتا ہے کیونکہ جو جتنا زیادہ جنگلوں اور پہاڑوں میں گھوم کر پھل لائے گا اتنا زیادہ مال کماتا ہے!

سردی کا موسم شروع ہوتے ہی سیتا پھل بازاروں اور سڑکوں کے کنارے فٹ پاتھ پر ڈھیروں مل جاتے ہیں۔ آج کل تو پھیری والے محلے محلے آواز لگا کر بھی بیچنے نکل جاتے ہیں۔ بہر حال سردی کے موسم میں سیتا پھل ہر جگہ آسانی سے مل جاتے ہیں۔ اس لیے موسمی پھل سیتا پھل کو ضرور کھانا چاہیے۔ سیتا پھل بے شمار ادویات کا پھل ہے۔ سیتا پھل باہر سے سخت اور اندر سے نرم ہوتا ہے لیکن پوری طرح پک جانے کے بعد یہ باہر سے بھی نرم ہوجاتا ہے اور مضبوطی سے پکڑ کر اٹھانے کی وجہ سے ٹوٹ جاتا ہے۔ اس لیے پکے ہوئے سیتا پھل کو نہایت احتیاط سے اٹھانا چاہیے۔ سیتا پھل نہایت میٹھا ہوتا ہے، اس کے اندر کا گودا سفید ملائی کی طرح ہوتا ہے اور کالے بیجوں کے اردگرد لپٹا ہوتا ہے۔ پیڑ پر پکے ہوئے سیتا پھل کا رنگ ہرا ہوتا ہے۔ کچا سیتا پھل توڑ کر گھر میں یا گودام میں پکانے سے اس کا رنگ کالا ہونے لگتا ہے۔

زمانے نے کافی ترقی کرلی ہے اور کھانے پینے کی چیزوں میں بھی بدلاؤ اور نیا پن آگیا ہے۔ اس لیے اب بازار میں سیتا پھل کا ذائقے دار شیک اور لذیذ آئس کریم بھی دستیاب ہے۔ سیتا پھل صحت کے لیے بہت مفید ہے۔ اس میں وٹامن ہوتے ہیں۔ خاص کر سیتا پھل میں Niyaseen نیاسین، رائی بوفلیوین Raibofelevin تھی یامن Thiyamin زیادہ مقدار میں پائے جاتے ہیں۔ اس کے استعمال سے ہمیں آئرن، کیلشیم، میگنشیم، میگنیز، پوٹاشیم اور فاسفورس کثیر تعداد میں ملتے ہیں جو ہماری اچھی صحت کے لیے بہت ضروری ہے۔ سیتا پھل کی یہ خصوصیت ہے کہ اس میں آئرن کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے۔ سیتا پھل میں پوٹاشیم اور میگنشیم دل کے لیے مفید ہوتا ہے۔ میگنشیم جسم کے اندر پانی کی کمی نہیں ہونے دیتا۔ سیتا پھل کے فائبر Faibar سے بلڈ پریشر کنٹرول میں رہتا ہے۔ اسے کھانے سے خون میں موجود کولسٹرال Colestaral بھی کم ہوتا ہے۔ سیتا پھل میں موجود وٹامن آئرن خون کی کمی کو دور کر کے گلوبین Hemogulobin کی مقدار کو بڑھاتا ہے۔ اگر آپ کو قبض کی شکایت ہے تو سیتا پھل کھانے سے یہ کافی حد تک دور ہوسکتا ہے۔ سیتا پھل میں کافی مقدار میں کاپر اور فائبر ہوتا ہے جو قبضیت کو کم کردیتا ہے اور اس کے مسلسل استعمال سے قبض دور ہوجاتا ہے۔ حاملہ خواتین کے لیے بھی سیتا پھل قدرت کا انمول تحفہ ہے۔ حمل کے دوران سیتا پھل کھانا فائدے مند ہے اس سے کمزوری دور ہوتی ہے۔ الٹی کی شکایت اور جی کا گھبرانا ٹھیک ہوتا ہے۔ صبح کی تھکان میں آرام ملتا ہے۔ اگر آپ کمزور ہیں آپ کا وزن کم ہے تو آپ سیتا پھل کو زیادہ سے زیادہ کھائیں اور جب تک بازار میں ملتے ہیں کھائیں، آپ کی کمزوری بھی دور ہوگی اور وزن بھی بڑھ جائے گا۔ سیتا پھل میں قدرتی شکر بہت زیادہ مقدار میں ہوتی ہے جو نقصان تو نہیں کرتی لیکن وزن بڑھانے اور کمزوری کو دور کرنے میں بے حد مدد کرتی ہے جس سے آپ کا جسم سڈول اور فربہ ہوتا ہے اور پچکے ہوئے گال ابھر جاتے ہیں جس سے آپ کی شخصیت میں نکھار آجاتا ہے اس لیے سیتا پھل خوب کھائیں، شاد رہیں آباد رہیں!

(تعارف فروری 2021 کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

■

Raunaq Jamal
'Kainat' Street No. 9
New Adarsh Nagar,
Durg - 491001 (Chhattisgarh)

آنکھ، مفاہیم اور متعلقات

آنکھ اٹکنا یا اٹک جانا: ہ۔ فعل لازم۔ آنکھ لگنا، آنکھ بجھنا، محبت ہوجانا، عشق ہوجانا، لگن لگنا، آشنائی ہوجانا۔

یاروں کو ہم دکھائیں گے بے طاقتی کا رنگ
اپنی بھی آنکھ گر کسی گل سے اٹک گئی (مصحفی)

آنکھ اٹھا کر دیکھنا: ہ۔ فعل متعدی (1) اونچی آنکھ کرکے دیکھنا، نظر بھر کر دیکھنا، نظر ملا کر دیکھنا، آنکھ ڈالنا، نظر ڈالنا، آنکھ ملانا، آنکھ اوپر کرکے دیکھنا، آنکھ سامنے کرکے دیکھنا، آنکھ بھر کر دیکھنا۔

اٹھا کر آنکھ تو تم دیکھ لو یاں کون دیکھے ہے
ذرا قربان ہونے دو ہمیں صدقے تمہارے ہم (جرأت)

آنکھ اٹھا کر اسے دیکھوں ہوں تو نظروں میں مجھے
یوں جتاتا ہے کہ کیا تجھ کو نہیں ڈر میرا (جرأت)

دیکھوں ہوں آنکھ اٹھا کر جس کو تو یہ کہے ہے
ہوتا ہے قتل کیونکر یہ بے گناہ دیکھوں (میر)

یہی دیکھا کہ اٹھوائے گئے بس
جو دیکھا ٹک ادھر کو آنکھ اٹھا کر (جرأت)

(2) التفات کی نظر سے دیکھنا، بنظر التفات دیکھنا، التفات کرنا، توجہ کرنا۔

ہم تو عاشقِ ناکس ٹھیرے کوئی نہ ادھر دیکھے گا
آنکھ اٹھا کر وہ دیکھے تو یہ بھی اس کی مروت ہے (میر)

بھر گیا دامنِ نظارہ گلِ نرگس سے
آنکھ اٹھا کر جو کبھی تو نے ادھر دیکھ لیا (آتش)

(فقرہ) جس کی طرف حضرت نے آنکھ اٹھا کر دیکھ لیا بس نہال ہی تو ہوگیا (بادشاہ یا درویش کامل کی نسبت بولتے ہیں)

آنکھ اٹھا کر نہ دیکھنا: فعل متعدی (1) نظر اونچی کرکے نہ دیکھنا، آنکھ بھر کر نہ دیکھنا، نظر ملا کر نہ دیکھنا۔

بعدِ مردن بھی ہے تیرا خوف مجھ کو اس قدر
آنکھ اٹھا کر میں نے جنت میں نہ دیکھا حور کو (ناسخ)

وہ اس طرف جو آنکھ اٹھا دیکھتے نہیں
میں اپنی زندگی بخدا دیکھتا نہیں (شہیدی)

(2) نہایت بے پروائی کرنا، آنکھ نہ ملانا، خاطر میں نہ لانا، کچھ نہ سمجھنا، کسی چیز سے دل اٹھا لینا، اکراہ کرنا، بے قدری کرنا،

بیزار ہونا۔

نہ دیکھا آنکھ اٹھا کر پھر ہلالِ عید کو ہم نے
تری جو ابروئے خمدار کو اے مہ لقا دیکھا (ظفر)

نہ دیکھے آنکھ اٹھا کر آہ وہ بیدرد ایسا ہے
جو روتے روتے آنکھوں سے مری آنسو نکل آئے (جرأت)

دوستی غیر سے واللہ جو منظور بھی ہو
آنکھ اٹھا کر نہ کبھی دیکھیں اگر حور بھی ہو

ہو حور بھی آنکھ اٹھا کر نہ دیکھیں ہم
کیا کیجیے کہ اب وہ طبیعت نہیں رہی (شیریں)

مر گئے لیکن نہ دیکھا تو نے ہرگز آنکھ اٹھا

(3) غرور سے متوجہ نہ ہونا، غرور کرنا، متکبر ہونا، مغرور ہونا، ابھمان کرنا، گھمنڈ کرنا، گھمنڈی ہونا، خود بین ہونا۔

آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اس نے نرگس کی طرف
جو کہ اے بے دید تیرے چشم کا بیمار تھا (سہر)

(2) شرم کرنا، شرم سے آنکھ سامنے نہ کرنا، شرم کے مارے آنکھ بھر کر نہ دیکھنا، لاجونتا ہونا، نادم ہونا، سکچانا، حجاب کرنا، منفعل ہونا، منہ چھپانا، محجوب ہونا، حیامند ہونا، صاحبِ حیا ہونا، حیا کرنا، شرم کرنا، علاج کرنا، لجانا۔

اللہ رے نازکی کہ حیا بار ہوگئی
کل مجھ کو آنکھ اٹھا کے بھی دیکھا نہ یار نے (ارشد)

نرگس نے جو نہ دیکھا پھر آنکھ اٹھا چمن میں
کیا جانے کس نے کس نے کیا کرلیا چمن میں (آتش)

آنکھ اٹھانا: ہ۔ فعل لازم (1) نظر اٹھانا، آنکھ اونچی کرنا، آنکھ اوپر کرنا، آنکھ سامنے کرنا، آنکھ سے آنکھ ملانا، آنکھ روبرو کرنا۔

اختیار آنکھ اٹھانے کا نہ جس کو ہو تو واں
کرسکے کیونکہ ہاں پھر کوئی مجبور دراز (جرأت)

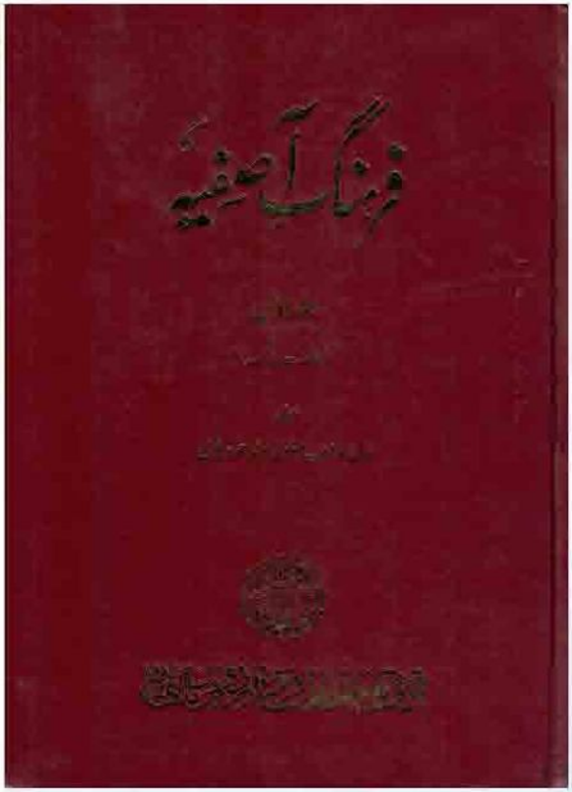

(2) باز رہنا، درگزر کرنا، کنارہ کش ہونا، دست بردار ہونا۔

جب آنکھ اٹھائی ہستی سے تب نین لگے مٹکانے کو
سب کاچھ کچھے سب ناچ نچے اس رسیا چھیل رجھانے کو (نظیر)

آنکھ اٹھ نہ سکنا یا نہ اٹھ سکنا: ہ۔ فعل لازم، شرم کے مارے آنکھ کا اونچا نہ ہوسکنا، آنکھ اونچی نہ ہونا، نہایت شرمندہ ہونا، منفعل ہونا، شرم کرنا، لحاظ کرنا، شرمندگی سے آنکھ نہ ملا سکنا، خجل ہونا۔

نامہ برخفت اٹھائے واں سے آیا کس قدر
آنکھ اٹھ سکتی نہیں اب نامہ بر کے سامنے (معروف)

■

ماخذ: فرہنگ آصفیہ (جلد اوّل)، **مولفہ:** خاں صاحب مولوی سید احمد دہلوی، **پانچویں طباعت:** 2016، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

چمن چمن کے پھول

شاعری میں بڑی طاقت ہے۔ اس سے تحریر و تقریر میں تاثیر پیدا ہوتی ہے، خطاب میں زور اور تحریر میں قوت پیدا کرنے کے لیے اشعار کا استعمال بہت کارگر ہوتا ہے۔ پرانے زمانے کے لوگوں کو استاد شعرا کے ہزاروں اشعار یاد ہوا کرتے تھے اور وہ موقعے کی مناسبت سے ان اشعار کا استعمال بھی کیا کرتے تھے۔

'چمن چمن کے پھول' میں مختلف رنگ اور شاعروں کے شعر اس لیے دیے جاتے ہیں تاکہ بچے موضوع کی مناسبت سے اچھے اشعار یاد کریں اور اپنی تحریر و تقریر میں اشعار کا موزوں اور برمحل استعمال کرسکیں۔ (ادارہ)

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

— مخدوم محی الدین

اور دنیا سے بھلائی کا صلہ کیا ملتا
آئینہ میں نے دکھایا تھا کہ پتھر برسے

— شکیب جلالی

مجھے زندگی کی دعا دینے والے
ہنسی آرہی ہے تری سادگی پر

— گوپال متل

دیوار کیا گری مرے کچے مکان کی
لوگوں نے میرے صحن میں رستے بنا لیے

— سید سبط علی صبا

دشمنی لاکھ سہی ختم نہ کیجیے رشتہ
دل ملے یا نہ ملے ہاتھ ملاتے رہیے

— ندا فاضلی

جس دن سے چلا ہوں مری منزل پہ نظر ہے
آنکھوں نے کبھی میل کا پتھر نہیں دیکھا

— بشیر بدر

کتنی آسانی سے مشہور کیا ہے خود کو
میں نے اپنے سے بڑے شخص کو گالی دی ہے

— ظفر گورکھپوری

گھر جل گئے تو کیا ہے بنالیں گے اور گھر
لیکن یہ دکھ بڑا ہے کہ رشتے بھی جل گئے

— ظفر صہبائی

تم آسماں کی بلندی سے جلد لوٹ آنا
ہمیں زمیں کے مسائل پہ بات کرنی ہے

— شاعر جمالی

وہ تو بتا رہا تھا کئی روز کا سفر
زنجیر کھینچ کر جو مسافر اتر گیا

— ہوش نعمانی

ایک پتھر کی بھی تقدیر سنور سکتی ہے
شرط یہ ہے کہ سلیقے سے تراشا جائے

— منظور ندیم

بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے
ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے

— حفیظ جونپوری

ننھے فنکار

ناظرہ بانو عثمان غنی، درجہ دہم، گورنمنٹ اردو گرلس ہائر سیکنڈری اسکول، حریر پورہ، برہانپور، مدھیہ پردیش

شاہنواز ابراہیم، درجہ ڈی ایل ایڈ
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (مین کیمپس)، گچی باؤلی، حیدرآباد، تلنگانہ

محمد عدنان ڈی کی محمد نعیم، درجہ دہم، بڈنیرہ، امراوتی، مہاراشٹر

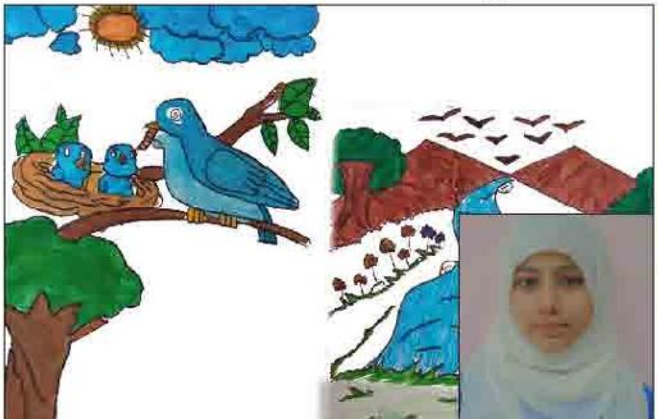

نازمین بانو شہاب الدین، درجہ دہم، گورنمنٹ اردو گرلس ہائر سیکنڈری اسکول، حریر پورہ، برہانپور، مدھیہ پردیش

رمیشہ ثمین محمد علیم، درجہ ہشتم، نگر پریشد اردو اسکول نانڈورہ (مہاراشٹر)

ریحان خان اشفاق خان سیکلگر، جماعت: نہم (ج)
ملت ہائی اسکول، مہرون، جلگاؤں، مہاراشٹر

عائشہ صدیقہ عقیل بیگ، درجہ ششم، الفاطمہ اردو ہائی اسکول، دھولیہ، مہاراشٹر

سہانا پروین صاحب خان، درجہ ششم، ضلع پریشد اردو اسکول، نیم گاؤں، بلڈانہ، مہاراشٹر

سعدیہ بانو محمد سلیم، درجہ ششم، الفاطمہ اردو ہائی اسکول، دھولیہ، مہاراشٹر

محمد زید محمد انیس، درجہ ہشتم، پیراڈائز کالونی، امراوتی، مہاراشٹر

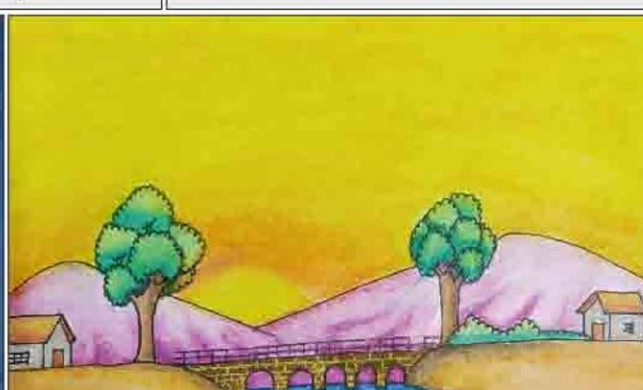

حفصہ عافیہ، درجہ دوم (سی)، جی ڈی گوینکا پبلک اسکول، سریتا وہار، نئی دہلی۔ 25

عشیرہ انم عطاء اللہ خان، اکوٹ، ضلع اکولہ، مہاراشٹر

قلمکاروں سے چند باتیں

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' ایک مقبول رسالہ ہے جس میں بچوں کے ذہن اور نفسیات کو نظر میں رکھتے ہوئے معلوماتی مضامین، دلچسپ کہانیاں، پیاری پیاری نظمیں اور دیگر مفید تحریریں شائع کی جاتی ہیں۔ اس رسالے میں کوشش کی جاتی ہے کہ پورے ہندوستان کی نمائندگی ہو مگر بسیار کوشش کے باوجود بہت سے علاقوں کی متناسب نمائندگی نہیں ہو پاتی ہے۔ ایسے علاقوں کے ادیبوں کی جستجو ہماری ترجیحی فہرست میں شامل ہے۔

- رسالے میں بچوں کے ادیبوں کے تعارف اور تصویر کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے تاکہ بچوں کے ادیبوں کی ڈائرکٹری ترتیب دینے والوں کو مدد مل سکے۔
- معلومات عامہ، صحت، زبان شناسی، تاریخ، تہذیب، سائنس و ٹیکنالوجی، جغرافیہ، آثار قدیمہ اور اہم شخصیات سے متعلق تخلیقات ترجیحی طور پر شائع کی جائیں گی۔
- 'مستقبل کے قلمکار' عنوان کے تحت بچوں کی تحریروں کو خاص طور پر شائع کیا جائے گا۔
- بچوں کے ادیبوں کے انٹرویوز اور رسائل کے مدیران پر ایک سیریز شروع کی جائے گی۔

قلمکاروں سے گذارش ہے کہ بچوں کی دنیا کے لیے تحریریں بھیجتے وقت درج ذیل امور کا خاص خیال رکھیں:

- بچوں کے لیے صرف وہی تخلیق ارسال کریں جس سے ان کی معلومات اور آگہی میں اضافہ ہو، خاص طور پر وہ تحریریں جو بچوں میں مطالعے کی تحریک اور ترغیب پیدا کریں۔
- تخلیق کی زبان آسان ہو، مشکل الفاظ سے گریز کریں تو بہتر ہوگا۔
- تخلیق غیر مطبوعہ ہو۔ کسی اخبار/ مجلّے میں ارسال نہ کی گئی ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 1200 (بارہ سو) الفاظ سے کم اور 2000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون کے ساتھ اپنا تعارف مع تصویر ارسال فرمائیں۔ تعارف میں بچوں کے لیے لکھی گئی کتابوں اور مضامین کا اندراج ضرور فرمائیں۔
- مضمون میں اعداد و شمار رومن میں لکھیں۔
- مضمون ادارے کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- تخلیق کی اشاعت کے درمیان کم سے کم تین (3) ماہ کا فاصلہ لازمی ہے۔ اس سے کم مدت میں تخلیق کی اشاعت کے لیے اصرار نہ فرمائیں۔
- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام، مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری ایڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔

قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کو زیادہ مفید مطلب بنانے کے لیے آپ سب کے مشوروں اور تعاون کی ضرورت ہے۔

—— ادارہ

बच्चों की दुनिया मासिक, नवंबर 2022, वर्ष 10, अंक 11
BACHON KI DUNIYA Monthly, November 2022 Vol. 10, Issue: 11
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL(S) - 01/3439/2022-24
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/10/2022
Date of Dispatch: 12 and 13 of advance Month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دلچسپ کتابیں

صفحات: [illegible]، قیمت: 20 روپے

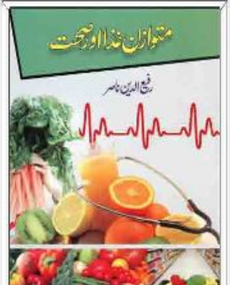

صفحات: 194، قیمت: [illegible] روپے

صفحات: 16، قیمت: 20 روپے

صفحات: [illegible]، قیمت: 20 روپے

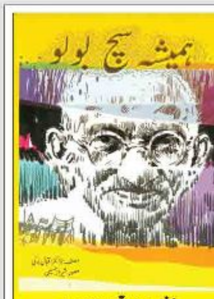

صفحات: 16، قیمت: 20 روپے

صفحات: 60، قیمت: 20 روپے

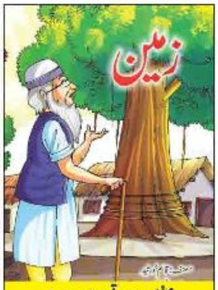

صفحات: 16، قیمت: 25 روپے

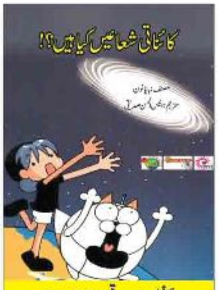

صفحات: 16، قیمت: 20 روپے

خریداری کے لیے رابطہ کریں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S. Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II, New Delhi - 110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi -110025.
LPC DELHI, DELHI PSO, DELHI RMS, DELHI-6